شذرات

اہل سیاست اور سیاسی استحکام	منظور الحسن	۲

قرآنیات

النساء (۴: ۳۴-۳۵)	جاوید احمد غامدی	۷

معارف نبوی

مختلف صلاحیت کے لوگ اسلام لانے کے بعد	معز امجد	۱۳
اچھی بات، ہمسایے کی عزت اور اکرام ضیف	طالب محسن	۱۹
ممنوع نذریں	محمد رفیع مفتی	۲۵

دین و دانش

ایمانیات (۱۵)	جاوید احمد غامدی	۳۵

نقطۂ نظر

جناب عمار خان ناصر اور مدیر "محدث" کے مابین مراسلت	محمد عمار خان ناصر / حافظ حسن مدنی	۴۷

یسئلون

متفرق سوالات	طالب محسن	۶۳
متفرق سوالات	محمد رفیع مفتی	۶۸

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

منظور الحسن

اہل سیاست اور سیاسی استحکام

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

پاکستان میں جمہوری اقدار کو غیر مستحکم کرنے کا الزام جس قدر فوج اور بیوروکریسی پر عائد کیا جاتا ہے، اسی قدر اس کے مستحق اہل سیاست بھی ہیں۔ جتنی یہ بات درست ہے کہ اگر فوج اور بیوروکریسی کے ادارے اپنے دائرۂ کار تک محدود رہتے تو ملک سیاسی خلفشار سے محفوظ رہتا، اتنی ہی یہ بات بھی صحیح ہے کہ اگر سیاست دان اپنے فرائض بخوبی انجام دیتے تو سیاسی استحکام کی منزل زیادہ مشکل نہ ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سیاست دانوں نے نہ صرف اپنے فرائض سے غفلت برتی ہے، بلکہ مجرمانہ افعال کا ارتکاب کیا ہے۔ گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں انھوں نے جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے بعد عوام کی لغت میں دھوکا اور سیاست ہم معنی الفاظ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ لوگوں کے لیے اب اس کا تصور ہی محال ہے کہ کوئی سیاست دان ہوس اقتدار سے بالاتر ہو کر ان کی ترقی کے لیے سرگرم ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے اس جمہوریت پسند دور میں بھی بعض سادہ لوح لوگوں کی زبان پر یہ بات آجاتی ہے کہ ان جیسے سیاست دانوں کے اقتدار سے تو فوجی حکومت ہی بہتر ہے۔

اس صورت حال کا سبب درحقیقت چند سنگین غلطیاں ہیں جو ہمارے سیاست دانوں کے طرز عمل میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں اور جن کی وجہ سے عوام ان سے مایوس ہو چکے ہیں۔

ان کے طرز عمل کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے حصول اقتدار کی جدوجہد کرتے ہوئے دین و اخلاق، اصول و قانون اور جمہوری اقدار کی کبھی پروا نہیں کی۔ مناصب کے حصول کے لیے اگر انھیں جھوٹ بولنا پڑا ہے تو انھوں نے بولا ہے، خوشامد کرنی پڑی ہے تو کی ہے، رشوت دینی پڑی ہے تو دی ہے، وقار کو داؤ پر لگانا پڑا ہے تو لگایا

ہے، یہاں تک کہ اقتدار کے قیام و دوام کے لیے اگر انھیں آمروں کے ہاتھ بھی مضبوط کرنے پڑے ہیں تو انھوں نے اس سے بھی دریغ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی میدان میں یہ لوگ فوج اور بیوروکریسی کے اشاروں پر حرکت کرنے والے کھلونوں سے زیادہ کوئی حیثیت کبھی اختیار نہیں کر سکے۔ ہماری سیاسی تاریخ کا یہ کوئی معمولی المیہ نہیں ہے کہ جب بھی کوئی غیر جمہوری اور غیر آئینی حکمران مسند اقتدار پر فائز ہوا ہے، ان اہل سیاست کی معتد بہ تعداد نے اپنی خدمات اسے پیش کر دی ہیں۔ ایسے موقعوں پر اگر کسی کی طرف سے کوئی مزاحمت بھی سامنے آئی ہے تو کسی اصول اور آدرش کی بنا پر نہیں، بلکہ محض مفادات اور تعصّبات ہی کی بنا پر سامنے آئی ہے۔

قائداعظم نے گورنر جنرل بننے کے بعد مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے کر جمہوری روایت کی بنا ڈالی، مگر لیاقت علی خان نے اسے توڑ کر جب وزارت عظمیٰ کے ساتھ مسلم لیگ کی صدارت بھی حاصل کرنا چاہی تو مسلم لیگی سیاست دانوں نے اسے خوش دلی سے قبول کیا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے پارلیمانی روایات کے علی الرغم پارلیمنٹ کی اکثریتی جماعت کے سربراہ خواجہ ناظم الدین کو برطرف کیا تو اہل سیاست خاموش رہے۔ اس کے بعد گورنر جنرل نے یکے بعد دیگرے محمد علی بوگرا اور چودھری محمد علی جیسے غیر سیاسی افراد کو وزیراعظم نامزد کیا تو مسلم لیگ کے اہل سیاست نے اس پر احتجاج کے بجائے انھیں اپنی جماعت کی صدارت بھی پیش کر دی۔ پھر گورنر جنرل نے منتخب دستور ساز اسمبلی توڑی تو اسے بھی کچھ احتجاج کے بعد قبول کر لیا گیا۔ بعد ازاں جب گورنر جنرل سکندر مرزا کے ایما پر مسلم لیگ کے مقابلے کے لیے ری پبلکن پارٹی تشکیل دی گئی جو نہ عوامی حمایت رکھتی تھی اور نہ مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کی اہل تھی تو مسلم لیگ کے بیش تر منتخب نمائندے اپنی جماعت چھوڑ کر اس میں شامل ہو گئے۔ اسی طرح جنرل ایوب خان، جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف نے جب غیر جمہوری طریقے سے حکومتیں قائم کیں تو انھیں بھی سیاست دانوں کے طائفے سے بے شمار لوگ میسر آ گئے۔ تاریخ کے اس جائزے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ہمارے اہل سیاست نے محض اپنے اقتدار کے لیے ملک میں سیاسی استحکام کو داؤ پر لگائے رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سیاست دان ہوس اقتدار سے بالاتر رہتے اور باہم متحد ہو کر غیر جمہوری حکمرانوں کے خلاف جدوجہد جاری رکھتے تو یہ ملک اس وقت مستحکم سیاسی اقدار کا حامل ہوتا۔

اہل سیاست کی دوسری غلطی یہ ہے کہ انھوں نے عوام کے ساتھ سراسر غیر سیاسی طرز عمل اختیار کیا۔ انھوں نے نہ عوام کے اندر اپنی جڑیں مضبوط کرنے کی طرف کبھی توجہ دی، نہ ان سے رابطے کا کوئی چینل قائم کیا اور نہ ان کی تنظیم سازی کی طرف مائل ہوئے۔ انھوں نے عوام سے اگر کچھ ربط و تعلق قائم بھی کیا تو اسے بھی انتخابی جلسے جلوسوں تک محدود

رکھا۔عوام سے مینڈیٹ لینے کے بجائے اکثر ان کی یہی کوشش رہی کہ کسی دوسرے ذریعے سے ایوان اقتدار میں پہنچا جائے۔اس مقصد کے لیے انھوں نے ہمیشہ عوام کی ترجیحات اور امنگوں کے برعکس معاملہ کیا۔

جب کبھی برسر اقتدار آئے تو عوام سے اپنا تعلق یکسر ختم کرلیا۔یہ تجربہ اکثر لوگوں نے کیا کہ جو سیاسی لیڈر انتخابات کے دنوں میں اس کے ساتھ محبت سے ملتے تھے، اس کے دکھ درد کو سنتے تھے اور اس کی حاجت روائی کے وعدے کرتے تھے، انھوں نے کامیاب ہوتے ہی اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ان سیاست دانوں نے اقتدار میں آ کر اگر کچھ پروا کی تو صرف اقربا، احباب اور قریبی کارکنان کی۔ترقی کے دروازے اگر کھولے گئے تو صرف قریبی لوگوں کے لیے اور اس ضمن میں میرٹ کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا۔

جو سیاسی جماعتیں تشکیل دیں، انھوں نے اپنے کارکنوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کے بجائے ارادت کے جذبات کو پروان چڑھایا۔انھیں اس بات کی ترغیب دی کہ قائد ہی کی بات حرف آخر ہے۔آج اگر وہ کسی بات کو غلط کہتا ہے تو وہ سراسر باطل ہے اور کل اسی بات کو صحیح کہتا ہے تو وہ عین حق ہے۔جماعت کے اندر اسی شخص کو ترقی کے مواقع فراہم کیے جو قائد کے اشارے پر بے بہا مال و زر لٹانے کے لیے تیار ہو یا اس کی مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے والا ہو۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ملکی سطح پر تو جمہوریت کے نعرے خوب بلند کیے، مگر اپنی جماعتوں کے اندر بدترین آمریت کا مظاہرہ کیا۔نہ کارکنوں کو اپنے قائدین منتخب کرنے کا موقع فراہم کیا، نہ نیچے سے اوپر تک مشاورت کا کوئی نظام وضع کیا اور نہ آزادی رائے کی گنجایش باقی رکھی۔عوام کو جب بھی سڑکوں پر نکالا تو اس مقصد کے لیے نکالا کہ وہ اپنی جانوں، اپنی املاک اور اپنے وقت کی قربانی دے کر ان کے اقتدار کی راہیں ہموار کریں۔

عوام کے ساتھ اس طرز عمل کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ وہ ان سے پوری طرح مایوس ہو گئے۔ان اہل سیاست پر نہ انھیں اعتماد رہا اور نہ کوئی تعلق خاطر وہ باقی رکھ سکے۔یہی وجہ ہے کہ اگر ہم انتخابات کے موقع پر ان سیاست دانوں کے لیے عوام کی حمایت کا تجزیہ کریں تو اس کی حقیقت صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی دانست میں بڑی برائی کے مقابلے میں چھوٹی برائی کو ترجیح دے رہے ہوتے ہیں۔

ان اہل سیاست کی تیسری بڑی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے ان جمہوری اقدار کو بھی پامال کر ڈالا جو ان کی اپنی بقا کے لیے ضروری تھیں۔وہ وعدے جن کی بنا پر انھوں نے عوام سے ووٹ لیے، برسر اقتدار آ کر ان پر عمل تو کجا، کسی کو یاد بھی نہیں رہے۔وہ جماعتیں جن کی حمایت سے وہ ایوان حکومت میں پہنچے، ان سے اپنی وفاداری تبدیل کر لینے میں انھیں کبھی تردد

نہ ہوا۔ وہ آئین اور قوانین جنھیں انھوں نے خود تخلیق کیا اور جن کی حفاظت پر وہ مامور ہوئے، ان کی خلاف ورزی کو سیاسی عمل کی ضرورت سمجھا۔ پارلیمنٹ میں اختلاف برائے اختلاف ہی کی روایت قائم کی۔ اگر حزب اختلاف کی نشستوں پر بیٹھے تو حکومت کے صحیح اقدامات کی بھی مخالفت کی اور اگر مسند حکومت پر فائز ہوئے تو حزب اختلاف کے وجود ہی کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ قوم کی معاشی بدحالی کے باوجود ایسی مراعات کو اپنے لیے مختص کیا جو دنیا کی بڑی ریاستوں کے ارباب اقتدار کو بھی حاصل نہیں ہیں۔ قومی خزانے میں مالی بدعنوانی کی ایسی داستانیں رقم کیں جنھیں سن کر راہ زن بھی کانوں کو ہاتھ لگائیں۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ سیاسی جماعتیں ہوں یا مقنّنہ اور انتظامیہ کے جمہوری ادارے، سب تباہ و برباد ہو کر رہ گئے۔

یہ اس طرز عمل کی ایک جھلک ہے جو ہمارے سیاست دانوں نے گزشتہ عرصے میں پیش کیا ہے۔ یہ تصویر سامنے لانے سے ہمارا مقصود یہ ہرگز نہیں ہے کہ لوگ ان کے بجائے کسی اور طرف رجوع کریں، وہ اچھے ہیں یا برے، بہرحال ملک کی زمام اقتدار سنبھالنا انھی کا استحقاق اور انھی کی ذمہ داری ہے۔ اس سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اہل سیاست ماضی کے آئینے کو اپنے سامنے رکھیں اور قومی تعمیر کے لیے اپنے کردار کو نئے سرے سے ترتیب دیں۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ النساء

(۱۱)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ، بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ، وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ، فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ، حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ، بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ

(میاں اور بیوی کے تعلق میں بھی اسی اصول کے مطابق) مرد عورتوں کے سربراہ بنائے گئے ہیں۔ اِس لیے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور اِس لیے کہ اُنھوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں[۸۲]۔ پھر جو نیک عورتیں ہیں، وہ (اپنے شوہروں کی) فرماں بردار ہوتی ہیں، رازوں کی حفاظت کرتی

---

[۸۲] یہ خاندان کی تنظیم کے لیے اللہ نے اپنا قانون بیان فرمایا ہے۔ خاندان کا ادارہ بھی، اگر غور کیجیے تو ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ جس طرح ہر ریاست اپنے قیام و بقا کے لیے ایک سربراہ کا تقاضا کرتی ہے، اسی طرح یہ ریاست بھی ایک سربراہ کا تقاضا کرتی ہے۔ سربراہی کا مقام اس ریاست میں مرد کو بھی دیا جا سکتا ہے اور عورت کو بھی۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ مرد کو دیا گیا ہے۔ آیت میں اس کے لیے 'قوامون علی النساء' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ عربی زبان میں 'قام' کے بعد 'علی' آتا ہے تو اس میں حفاظت، نگرانی، تولیت اور کفالت کا مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔ سربراہی کی حقیقت یہی ہے اور اس میں یہ سب چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اپنے اس فیصلے کے حق میں قرآن نے دو دلیلیں دی ہیں۔ استاذ امام ان کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَھُنَّ، فَعِظُوۡھُنَّ، وَاھۡجُرُوۡھُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ، وَاضۡرِبُوۡھُنَّ،

ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے بھی رازوں کی حفاظت کی ہے۔[83] اور (اسی اصول پر تم کو حق دیا گیا ہے کہ) جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو،[84] اُنھیں نصیحت کرو اور اُن کے بستروں پر اُنھیں تنہا چھوڑ دو اور

''ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت بخشی ہے۔ مرد کو بعض صفات میں عورت پر نمایاں تفوق حاصل ہے جن کی بنا پر وہی سزاوار ہے کہ قوامیت کی ذمہ داری اسی پر ڈالی جائے۔ مثلاً محافظت و مدافعت کی جو قوت و صلاحیت یا کمانے اور ہاتھ پاؤں مارنے کی جو استعداد و ہمت اس کے اندر ہے، وہ عورت کے اندر نہیں ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث کلی فضیلت نہیں ہے، بلکہ صرف وہ فضیلت ہے جو مرد کی قوامیت کے استحقاق کو ثابت کرتی ہے۔ بعض دوسرے پہلو عورت کی فضیلت کے بھی ہیں، لیکن ان کو قوامیت سے تعلق نہیں ہے۔ مثلاً عورت گھر در سنبھالنے اور بچوں کی پرورش و نگہداشت کی جو صلاحیت رکھتی ہے، وہ مرد نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے قرآن نے یہاں بات ابہام کے انداز میں فرمائی ہے جس سے مرد اور عورت، دونوں کا کسی نہ کسی پہلو سے صاحب فضیلت ہونا نکلتا ہے۔ لیکن قوامیت کے پہلو سے مرد ہی کی فضیلت کا پہلو راجح ہے۔

دوسری یہ کہ مرد نے عورت پر اپنا مال خرچ کیا ہے۔ یعنی بیوی بچوں کی معاشی اور کفالتی ذمہ داری تمام اپنے سر اٹھائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری مرد نے اتفاقیہ یا تبرعاً نہیں اٹھائی ہے، بلکہ اس وجہ سے اٹھائی ہے کہ یہ ذمہ داری اسی کے اٹھانے کی ہے۔ وہی اس کی صلاحیتیں رکھتا ہے اور وہی اس کا حق ادا کرسکتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۲۹۱)

[۸۳] میاں اور بیوی کے تعلق میں شوہر کو قوام قرار دینے کے بعد خاندان کے نظم کو صلاح وفلاح کے ساتھ قائم رکھنے کے لیے یہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں سے دو چیزوں کا تقاضا کیا ہے:

ایک یہ کہ انھیں اپنے شوہروں کے ساتھ موافقت اور فرماں برداری کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

دوسری یہ کہ شوہر کے رازوں اور اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرنی چاہیے۔

پہلی بات تو محتاج وضاحت نہیں، اس لیے کہ نظم خواہ ریاست کا ہو یا کسی ادارے کا، اطاعت اور موافقت کے بغیر ایک دن کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ نظم کی فطرت ہے۔ اسے نہ مانا جائے تو وہ نظم نہیں، بلکہ اختلال و انتشار ہوگا جس کے ساتھ کوئی ادارہ بھی وجود میں نہیں آتا۔

رہی دوسری بات تو اس کے لیے قرآن نے 'حٰفظٰت للغیب' کی تعبیر اختیار کی ہے۔ عام طور پر اس کے معنی

فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَيۡهِنَّ سَبِيۡلًا، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيۡرًا﴿۳۴﴾

(اِس پر بھی نہ مانیں تو) اُنھیں سزا دو۔ پھر اگر وہ اطاعت کا رویہ اختیار کریں تو اُن پر الزام کی راہ نہ ڈھونڈو۔ بے شک، اللہ بہت بلند ہے، وہ بہت بڑا ہے[۸۵]۔ ۳۴

پیٹھ پیچھے کی حفاظت کے لیے جاتے ہیں۔ ہم نے اسے رازوں کی حفاظت کرنے والی کے معنی میں لیا ہے۔ اس کا یہی مفہوم ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے:

''...یہ معنی لینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ 'غیب' کا لفظ راز کے مفہوم کے لیے مشہور ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں ترکیب کلام ایسی ہے کہ ''پیٹھ پیچھے'' کے معنی لینے کی گنجایش نہیں، تیسری یہ کہ عورت اور مرد کے درمیان رازوں کی امانت داری کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا مسئلہ ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے قدرتی امین ہیں۔ بالخصوص عورت کا مرتبہ تو یہ ہے کہ وہ مرد کے محاسن و معائب، اس کے گھر در، اس کے اموال و املاک اور اس کی عزت و ناموس ہر چیز کی ایسی رازدان ہے کہ اگر وہ اس کا پردہ چاک کرنے پہ آ جائے تو مرد بالکل ہی ننگا ہو کر رہ جائے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس صفت کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔ اس کے ساتھ 'بما حفظ اللّٰہ' کا جو اضافہ ہے، اس سے اس صفت کی عالی نسبی کا اظہار مقصود ہے کہ ان کی اس صفت پر خدا کی صفت کا ایک پرتو ہے، اس لیے کہ خدا نے بھی اپنے بندوں اور بندیوں کے رازوں کی حفاظت فرمائی ہے، ورنہ وہ لوگوں کا پردہ چاک کرنے پر آ جاتا تو کون ہے جو کہیں منہ دکھانے کے قابل رہ جاتا۔'' (تدبر قرآن ۲/۲۹۲)

قرآن نے فرمایا ہے کہ صالح بیویوں کا رویہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو عورتیں سرکشی اور تمرد اختیار کریں یا گھر کے راز دوسروں پر افشا کرتی پھریں، وہ خدا کی نگاہ میں ہرگز صالحات نہیں ہیں۔

[۸۴] اصل میں 'نشوز' کا لفظ آیا ہے۔ اس کے معنی سر اٹھانے کے ہیں، مگر اس کا زیادہ استعمال اس سرکشی اور شوریدہ سری کے لیے ہوتا ہے جو کسی عورت سے اس کے شوہر کے مقابل میں ظاہر ہو۔ یہ لفظ عورت کی ہر کوتاہی، غفلت یا بے پروائی یا اپنے ذوق اور رائے اور اپنی شخصیت کے اظہار کی فطری خواہش کے لیے نہیں بولا جاتا، بلکہ اس رویے کے لیے بولا جاتا ہے، جب وہ شوہر کی قوامیت کو چیلنج کر کے گھر کے نظام کو بالکل تلپٹ کر دینے پر آمادہ نظر آتی ہے۔

[۸۵] یہ اس سوال کا جواب ہے کہ کوئی عورت اگر موافقت کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے سرکشی پر اتر آئے اور شوہر کے گھر میں رہتے ہوئے اس کو شوہر ماننے سے انکار کر دے تو اس کی اصلاح کے لیے شوہر کیا اس کی تادیب کر سکتا ہے؟ فرمایا ہے کہ معاملہ یہاں تک پہنچ رہا ہو تو مرد تین صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا، فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ، وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا، اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا، يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

اور اگر (اِس کے بعد بھی صورت حال بہتر نہ ہو اور) تم میاں اور بیوی کے درمیان افتراق کا اندیشہ محسوس کرو تو ایک حکم مرد کے لوگوں میں سے اور ایک عورت کے لوگوں میں سے مقرر کر دو۸۶۔ (اِس سے توقع ہے کہ) اگر (میاں اور بیوی)، دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ اُن کے درمیان

پہلی یہ کہ عورت کو نصیحت کی جائے۔ آیت میں اس کے لیے 'وعظ' کا لفظ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں کسی حد تک زجر و توبیخ بھی ہو سکتی ہے۔

دوسری یہ کہ اس سے بے تکلفانہ قسم کا خلا ملا ترک کر دیا جائے تا کہ اسے اندازہ ہو کہ اس نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اس کے نتائج غیر معمولی ہو سکتے ہیں۔

تیسری یہ کہ عورت کو جسمانی سزا دی جائے۔ یہ سزا، ظاہر ہے کہ اتنی ہی ہو سکتی ہے جتنی کوئی معلم اپنے زیر تربیت شاگردوں کو یا کوئی باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حد 'غیر مبرح*' کے الفاظ سے متعین فرمائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی سزا نہ دی جائے جو کوئی پایدار اثر چھوڑے۔

آیت کے انداز بیان سے واضح ہے کہ ان تینوں میں ترتیب و تدریج ملحوظ ہے۔ یعنی پہلی کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری صورت اسی وقت اختیار کرنی چاہیے، جب آدمی مطمئن ہو جائے کہ بات نہیں بنی اور اگلا قدم اٹھانے کے سوا چارہ نہیں رہا۔ مرد کے تادیبی اختیارات کی یہ آخری حد ہے۔ قرآن نے فرمایا ہے کہ اگر اس سے اصلاح ہو جائے تو عورت کے خلاف انتقام کی راہیں نہیں ڈھونڈنی چاہییں۔ چنانچہ 'ان اللّٰہ کان علیاً کبیرًا' کے الفاظ میں تنبیہ کی گئی ہے کہ سب سے بلند اور سب سے بڑا خدا ہے۔ وہ جب آسمان و زمین کا مالک ہو کر بندوں کی سرکشی سے درگزر فرماتا ہے اور توبہ و اصلاح کے بعد نافرمانیوں کو معاف کر دیتا ہے تو اس کے بندوں کو بھی دوسروں پر اختیار پا کر اپنے حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔

[۸۶] یعنی مرد وہ سارے جتن، جو اوپر بیان ہوئے ہیں، کرنے کے بعد بھی عورت کے نشوز پر قابو نہیں پا سکا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اب اس رشتے کو قائم رکھنا آسان نہیں رہا۔ لیکن اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ یہ نہیں

---

* ابوداؤد، رقم ۱۹۰۵۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

موافقت پیدا کر دے گا۔ بے شک، اللہ علیم و خبیر ہے[۸۷]۔ ۳۵

چاہتا کہ وہ بیوی کو طلاق دے کر جان چھڑا لے۔ چنانچہ اصلاح احوال کے لیے یہ ایک دوسری تدبیر اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اور میاں بیوی کے قبیلہ، برادری اور ان کے رشتہ داروں اور خیر خواہوں سے کہا ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر معاملات کو سدھارنے کی کوشش کریں۔

[۸۷] یہ نہایت بلیغ اسلوب میں میاں بیوی کو ترغیب دی ہے کہ انھیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وہ اگر افتراق کے بجائے سازگاری چاہیں گے تو ان کا پروردگار بڑا کریم ہے۔ اس کی توفیق ان کے شامل حال ہو جائے گی۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معز امجد

مختلف صلاحیت کے لوگ اسلام لانے کے بعد

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

روی[1] أنه قيل لرسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: يا رسول اللّٰه، من أكرم الناس؟ قال أكرمهم[2] عند اللّٰه[3] أتقاهم للّٰه[4]. فقالوا: ليس عن هذا نسألك. فقال: فأكرم الناس[5] يوسف نبى اللّٰه بن نبى اللّٰه بن نبى اللّٰه بن خليل اللّٰه. قالوا: ليس هذا نسألك. قال فعن معادن العرب تسألون[6]. الناس معادن فى الخير والشر، كمعادن الفضة والذهب[7]، خيارهم فى الجاهلية خيارهم فى الإسلام[8] إذا فقهوا فى الدين[9].

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول، لوگوں میں سے سب سے زیادہ عزت والا کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا آدمی وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے[10]۔ لوگوں نے کہا: ہم اس بارے میں نہیں پوچھ رہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: تو لوگوں میں سے سب سے زیادہ عزت والے یوسف علیہ السلام ہیں جو خود بھی اللہ کے نبی تھے اور اللہ کے نبی کے بیٹے، اللہ کے نبی کے پوتے اور اللہ

کے دوست کے پڑپوتے تھے[۲]۔ لوگوں نے کہا کہ ہم اس بارے میں بھی نہیں پوچھ رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا تو تم عرب کی کانوں کے بارے میں پوچھ رہے ہو۔ لوگ اچھائی اور برائی کے معاملے میں سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح ہیں۔ ان میں سے جو دور جاہلیت میں بہترین تھے، وہ دور اسلام میں بھی بہترین ہوں گے، اگر وہ اپنے اندر دین کی سمجھ بوجھ پیدا کر لیں[۳]۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب یہ پوچھا گیا کہ لوگوں میں سے سب سے زیادہ معزز کون ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سمجھے کہ اس بارے میں پوچھا جا رہا ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز کون ہے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ جواب دیا۔ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز کون ہے، قرآن مجید میں یہ بات اس طرح بیان ہوئی ہے:

اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ. (الحجرات ۴۹: ۱۳) ''اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہے۔''

۲۔ جب لوگوں نے بتایا کہ ان کا سوال اصلاً وہ نہیں تھا جس کا جواب دیا گیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندانی مرتبے کے حوالے سے جواب دیا کہ یوسف علیہ السلام سب سے زیادہ معزز ہیں، کیونکہ ان کے خاندان میں مسلسل چار نسلوں تک نبوت رہی ہے۔ یوسف علیہ السلام خود بھی نبی تھے، ان کے والد یعقوب علیہ السلام بھی نبی تھے، ان کے دادا اسحٰق علیہ السلام بھی نبی تھے اور ان کے پردادا ابراہیم علیہ السلام نہ صرف یہ کہ اللہ کے نبی تھے، بلکہ اللہ نے ان کو اپنا دوست بنایا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کی دوستی کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح سے ہے:

وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبۡرٰھِیۡمَ خَلِیۡلًا. (النساء ۴: ۱۲۵) ''اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا۔''

۳۔ پوچھنے والوں نے جب یہ وضاحت کی کہ ان کا سوال خاندانی مرتبے کے حوالے سے بھی نہیں ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں پھر اس پہلو سے جواب دیا ہے کہ اہل عرب میں سے صلاحیت کے اعتبار سے کون سب سے زیادہ معزز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہلو سے جو جواب دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاقی اعتبار سے لوگوں کی مثال سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح ہے کہ جس طرح چاندی، خواہ کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہو، وہ سونے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جیسی نہیں ہوسکتی، اسی طرح لوگوں میں بھی کوئی سونے کی طرح ہے اور کوئی چاندی کی طرح اور سونے جیسی صلاحیتوں والا آدمی اسلام لانے کے بعد بھی سونا ہی رہے گا اور چاندی جیسی صلاحیتوں والا آدمی اسلام لانے کے بعد بھی چاندی ہی رہے گا، تاہم دین کی سمجھ بوجھ وہ چیز ہے کہ جس سے لوگوں کی صلاحیتوں کے استعمال کا رخ تبدیل ہوتا ہے اور انھیں اس بات کی رہنمائی ملتی ہے کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو کس بہتر مقصد کے لیے بروے کار لانا ہے۔

متن کے حواشی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۱۔ یہ روایت اپنی اصل کے اعتبار سے بخاری، رقم ۳۱۷۵ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ درج ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

بخاری، رقم ۳۱۹۴، ۳۲۰۳، ۳۳۰۱، ۳۳۰۴، ۳۳۰۵، ۳۳۹۴، ۴۴۱۲؛ مسلم، رقم ۲۳۷۸، ۲۵۲۶، ۲۶۳۸؛ ابن حبان، رقم ۹۲، ۶۴۸، ۵۷۵۷؛ سنن الکبریٰ، رقم ۱۱۲۴۹؛ دارمی، رقم ۲۲۳؛ احمد بن حنبل، رقم ۷۴۸۷، ۷۵۳۴، ۹۰۶۸، ۹۴۰۲، ۹۵۶۴، ۹۶۵۱، ۱۰۳۰۰، ۱۰۳۰۱، ۱۰۳۰۲، ۱۰۴۷۵، ۱۰۸۰۱، ۱۰۹۶۹، ۱۰۹۸۸، ۱۵۱۵۲؛ ابویعلیٰ، رقم ۶۰۷۰، ۷۱۷۱، ۶۴۲، ۶۵۶۲؛ حمیدی، رقم ۱۰۴۵؛ عبدالرزاق، رقم ۲۰۶۴۱؛ ابن ابی شیبہ، رقم ۳۱۹۱۹۔

۲۔ 'أكرمهم' (ان میں سے سب سے زیادہ معزز) کے الفاظ بخاری، رقم ۳۱۹۴ میں روایت ہوئے ہیں۔

۳۔ 'عند الله' (اللہ کے نزدیک) کے الفاظ بخاری، رقم ۴۴۱۲ میں روایت ہوئے ہیں۔

۴۔ لفظ 'لله' (اللہ کے معاملے میں) بخاری، رقم ۳۲۰۳ میں نقل ہوا ہے۔

۵۔ 'فأكرم الناس' (تو لوگوں میں سے سب سے زیادہ معزز) کے الفاظ بخاری، رقم ۳۱۹۴ میں روایت ہوئے ہیں۔

۶۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۳۱۹۴ میں 'تسألون' (تم پوچھ رہے ہو) کے بجائے 'تسألونني' (تم مجھ سے پوچھ رہے ہو) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۳۱۹۴ میں 'فعن معادن العرب تسألونني' (تو تم مجھ سے عرب کی کانوں کے بارے میں پوچھ رہے ہو) کے بعد 'قالوا: نعم' (لوگوں نے کہا: ہاں) کے الفاظ کا اضافہ ہے۔

۷۔ 'الناس معادن، كمعادن الفضة والذهب' (لوگ کانوں کی طرح ہیں۔ سونے اور چاندی کی

کانوں کی طرح) کے الفاظ مسلم، رقم ۲۶۳۸ میں روایت ہوئے ہیں۔

ابن حبان، رقم ۹۲ میں 'الناس معادن' (لوگ کانوں کی طرح ہیں) کے بعد 'فی الخیر و الشر' (اچھائی اور برائی کے معاملے میں) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۸۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۳۲۰۳ میں 'الناس معادن، خیارھم فی الجاھلیة خیارھم فی الإسلام' (لوگ کانوں کی طرح ہیں، ان میں سے جو دور جاہلیت میں بہترین ہوں گے، وہی دور اسلام میں بھی بہترین ہوں گے) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں، جبکہ بعض روایات، مثلاً ابن حبان، رقم ۹۲ میں 'الناس معادن فی الخیر والشر، خیارھم فی الجاھلیة خیارھم فی الإسلام' (لوگ اچھائی اور برائی کے معاملے میں کانوں کی طرح ہیں، ان میں سے جو دور جاہلیت میں بہترین ہوں گے، وہی دور اسلام میں بھی بہترین ہوں گے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً سنن الکبریٰ، رقم ۱۱۲۴۹ میں 'خیارھم فی الجاھلیة خیارھم فی الإسلام' (ان میں سے جو دور جاہلیت میں بہترین ہوں گے، وہی دور اسلام میں بھی بہترین ہوں گے) کے بعد 'فـإن' (چنانچہ) کے لفظ کا اضافہ ہے۔

بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۳۱۹۴ میں 'خیارھم فی الجاھلیة خیارھم فی الإسلام' (ان میں سے جو دور جاہلیت میں بہترین ہوں گے، وہی دور اسلام میں بھی بہترین ہوں گے) کے بجائے 'خیارکم فی الجاھلیة خیارکم فی الإسلام' (تم میں سے جو دور جاہلیت میں بہترین ہوں گے، وہی دور اسلام میں بھی بہترین ہوں گے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں، جبکہ بعض روایات، مثلاً ابن حبان، رقم ۶۴۸ میں 'خیارکم خیارکم فی الإسلام' (تم میں سے بہترین اسلام لانے کے بعد بھی بہترین رہیں گے) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۹۔ 'فی الدین' (دین میں) کے الفاظ احمد بن حنبل، رقم ۹۰۶۸ میں روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً مسلم، رقم ۲۵۲۶ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے گئے کسی سوال کا ذکر نہیں ملتا، بلکہ روایت سادہ طور پر اس طرح نقل ہوئی ہے:

تجدون الناس معادن. فخیارھم فی الجاھلیة خیارھم فی الإسلام إذا فقھوا. تجدون من خیر الناس فی ھذا الأمر أکرھھم لہ قبل أن یقع فیہ

''تم لوگوں کو کانوں کی طرح پاؤ گے۔ چنانچہ ان میں سے جو دور جاہلیت میں بہترین تھے، وہی دور اسلام میں بھی بہترین ہوں گے، اگر وہ دین میں سمجھ بوجھ پیدا کر لیں۔ تم (حکمرانی کے) اس معاملے میں سب

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

وتجدون من شرار الناس ذا الوجهين الذى يأتى هؤلاء بوجه وهؤلاء بوجه.

سے بہتر آدمی اس کو پاؤ گے جو اسے سب سے زیادہ ناپسند کرتا ہو، اس سے پہلے کہ وہ اس میں جا پڑے۔ اور لوگوں میں سے سب سے برے آدمی تم منافقوں کو پاؤ گے جو بعض لوگوں میں ایک چہرہ لے کر آئیں اور بعض میں دوسرا چہرہ لے کر۔''

بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۳۳۹۴ میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ راویوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف روایتوں کو غلطی سے ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ یہ روایت اس طرح نقل ہوئی ہے:

لا تقوم الساعة حتى تقاتلوا قوما نعالهم الشعر وحتى تقاتلوا الترك صغار الأعين حمر الوجوه ذلف الأنوف كأن وجوههم المجان المطرقة. وتجدون من خير الناس أشدهم كراهية لهذا الأمر حتى يقع فيه. والناس معادن: خيارهم فى الجاهلية، خيارهم فى الإسلام وليأتين على أحدكم زمان لأن يرانى أحب إليه من أن يكون له مثل أهله وماله.

''قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ تم ایک ایسی قوم سے نہ لڑو جن کے جوتے اون کے ہوں گے اور جب تک تم ترکوں سے نہ لڑو جن کی آنکھیں چھوٹی ہوں گی، چہرے سرخ ہوں گے اور ناک چپٹے گویا کہ ان کے چہرے ہموار ڈھالوں کی طرح ہوں گے۔ تم دیکھو گے کہ سب سے اچھا آدمی (حکمرانی کے) اس معاملے کو سب سے زیادہ ناپسند کرے گا، یہاں تک کہ وہ اس میں جا پڑے۔ اور لوگ کانوں کی طرح ہیں۔ ان میں سے جو دور جاہلیت میں بہترین ہوں گے، وہی دور اسلام میں بھی بہترین ہوں گے۔ ایک ایسا وقت آئے گا جب تم میں سے کوئی یہ چاہے گا کہ وہ مجھے دیکھ لے بجائے اس کے کہ اس کا خاندان اور اس کا مال دوگنا ہو جائے۔''

اسی طرح بعض دوسری روایات، مثلاً مسلم، رقم ۲۶۳۸ میں بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ راویوں نے دو مختلف روایتوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہ روایت اس طرح نقل ہوئی ہے:

الناس معادن كمعادن الفضة والذهب. خيارهم فى الجاهلية

''لوگ چاندی اور سونے کی کانوں کی مانند ہیں۔ جو دور جاہلیت میں سب سے اچھے تھے، وہ دور اسلام میں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

خيـــارهـــم فـی الإسـلام إذا فـقهـوا. والأرواح جـنـود مجندة، فما تعارف منها ائتلف وما تناكر منها اختلف.

بھی سب سے اچھے رہیں گے، اگر وہ سمجھ بوجھ پیدا کر لیں۔اور انسانی ارواح (اس دنیا میں آنے سے قبل) جمع شدہ لشکر (کی مانند) تھیں۔جن کی (وہاں) ایک دوسرے سے انسیت ہوئی، وہ (یہاں بھی) آپس میں مانوس ہیں اور جو (وہاں) ایک دوسرے کے لیے نامانوس تھیں، ان کی شخصیتوں میں (یہاں بھی) اختلاف ہے۔''

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ وترتیب: اظہار احمد

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

طالب محسن

اچھی بات، ہمسایے کی عزت اور اکرام ضیف

(مسلم، رقم ۴۷۔۴۸)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِی صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ فَلْیَقُلْ خَیْرًا أَوْلِیَصْمُتْ. وَمَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ فَلْیُكْرِمْ جَارَهُ. وَمَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ فَلْیُكْرِمْ ضَیْفَهُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اچھی بات کرے یا خاموش رہے۔ جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنے ہمسایے کی عزت کرے۔ جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ مہمان کی عزت کرے۔

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: وَمَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ فَلَا یُؤْذِی جَارَهُ. وَمَنْ كَانَ

يُـؤْمِـنُ بِـالـلّٰـهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ. وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِفَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْلِيَسْكُتْ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنے ہمسایے کو تکلیف نہ پہنچائے۔ جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے۔ جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اچھی بات کرے یا چپ رہے۔

عَـنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِـيَ الـلّٰـهُ عَـنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِثْلِ حَدِيْثِ أَبِي حَصِيْنٍ غَيْرَ أَنَّهُ قَالَ: فَلْيُحْسِنْ جَارَهُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت بھی منقول ہے۔ یہ روایت ابو حصین کی روایت کے مطابق ہے، لیکن اس میں ایک جملہ مختلف ہے۔ اس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے چاہیے کہ اپنے ہمسایے کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عَـنْ أَبِي شُرَيْحٍ الْخُزَاعِي رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَـالَ: مَـنْ كَـانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُحْسِنْ إِلَى جَارِهِ. وَمَنْ كَانَ يُـؤْمِـنُ بِـالـلّٰـهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ. وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِفَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْلِيَسْكُتْ.

حضرت ابوشریح خزاعی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ ہمسایے سے اچھا سلوک کرے۔ جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے۔ جو اللہ اور آخرت کے دن پر

ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اچھی بات کرے یا چپ رہے۔

لغوی مباحث

فلیقل خیرا أؤ لیصمت: (وہ اچھی بات کہے یا چپ رہے۔) یہ امر کے صیغے ہیں۔ بعض شارحین نے یہ بحث کی ہے کہ یہ امر وجوب پر دلالت کرتا ہے یا ندب پر۔ ان کی رائے یہ ہے کہ امر کی یہ صورت وجوب پر دلالت نہیں کرتی۔ ہمارے نزدیک امر کا صیغہ بنائے استدلال نہیں ہے۔ اس سے ملتی جلتی روایات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کسی فرد کو مخاطب بنایا ہے تو امر کے مخاطب کے صیغے بھی استعمال کیے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان روایات میں ایمان کے ثمرات بیان ہوئے ہیں۔ ثمرات ونتائج ہمیشہ ہدف ہوتے ہیں۔ انھیں فرض ونفل قرار دینا کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معنی

یہ روایت اس فلسفے کی تردید کرتی ہے کہ مذہب صرف عبادات اور اورادو وظائف کا نام ہے۔ قرآن مجید نے ایمان قبول کرنے والوں سے صرف عبادات ہی کا تقاضا نہیں کیا، بلکہ انھیں معاشرے میں اپنے خاندان، معاشرے اور اہل تعلق کے ساتھ بہترین اخلاق کے ساتھ پیش آنے کا بھی کہا ہے۔ جب آدمی ایمان قبول کرتا ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور ذکر اذکار کا اہتمام کرنے لگتا ہے تو بسا اوقات یہ چیز نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ ابنائے نوع کے حوالے سے اس کی ذمہ داری کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نوع کے ارشادات اسی دوسرے پہلو کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس روایت میں ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ اچھی بات کہو یا چپ رہو۔ حقیقت یہ ہے کہ گناہوں کا ایک پورا طائفہ ہے جو زبان کے غلط استعمال سے متعلق ہے۔ چغلی، غیبت، دھوکا، الزام تراشی، بدظنی، تنابز بالالقاب، اس طرح کے جتنے بھی جرائم ہیں، ان کا ارتکاب زبان ہی کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے زبان کی کھیتی کے بارے میں متنبہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ. اِذۡ یَتَلَقَّی الۡمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیۡدٌ. مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا	''اور ہم اس کی رگ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ (دھیان رکھو،) جبکہ دو اخذ کرنے والے اخذ کرتے رہتے ہیں۔ ایک دائیں بیٹھا اور دوسرا بائیں

لَدَيۡهِ رَقِيۡبٌ عَتِيۡدٌ. (ق ۵۰: ۱۶-۱۸)

بیٹھا۔ وہ کوئی لفظ بھی نہیں بولتا، مگر اس کے پاس ایک مستعد نگران موجود ہوتا ہے۔''

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ جرائم محض زبان کے جرائم نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ سماعت، بینائی اور خیالات بھی شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے واضح کیا ہے:

وَلَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ، اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡئُوۡلًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۶)

''اور جس چیز کا تمھیں علم نہیں ہے، اس کے درپے نہ ہوا کرو۔ کیونکہ کان، آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک چیز سے اس کی بابت پرسش ہونی ہے۔''

قرآن مجید کے یہ ارشادات قول و عمل کے بارے میں بے پروائی پر متنبہ کر رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں اسی احتیاط کی تلقین دوسرے الفاظ میں کی گئی ہے۔

بعض شارحین نے اس ارشاد کا یہ تقاضا بیان کیا ہے کہ صرف وہی بات زبان سے نکالنی چاہیے جس پر اجر کا یقین ہو۔ ہمارے نزدیک اس شدت کی ضرورت نہیں ہے۔ مراد صرف یہ ہے کہ بات کا محرک برا نہ ہو اور بات کا ظاہر بھی اچھا اور مناسب ہو۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

دوسری بات اس روایت میں ہمسایے کی عزت کی کہی گئی ہے۔ ہم پچھلی روایت میں یہ بیان کر چکے ہیں کہ قرآن مجید نے ہمسائیگی میں قرب مکانی کی تمام صورتوں کو شامل کر لیا ہے۔ چنانچہ حسن سلوک کا یہ تقاضا ہر طرح کے ہمسایے کے لیے ہے۔ روایات میں ہمسایے کے ساتھ اچھے سلوک کو تین اسالیب میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ اس کی عزت کرو۔ دوسرا یہ کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ تیسرا یہ کہ اس کو اذیت نہ دو۔ یہ تینوں باتیں ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ ممکن ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر یہ تینوں اسلوب ہی اختیار کیے ہوں۔ قرآن مجید نے اس کے لیے حسن سلوک کا جامع لفظ اختیار کیا ہے۔ باقی دونوں لفظ اسی کی شرح یا عملی اطلاق کی صورت ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب یہ پوچھا گیا کہ ہمسایے کا حق کیا ہے تو آپ نے اس کے جواب میں متعدد باتیں ارشاد فرمائیں۔ مثلاً یہ کہ جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کرو۔ جب مدد مانگے تو اس کی مدد کرو۔ اپنی دیوار اس کی مرضی کے بغیر اونچی نہ کرو وغیرہ۔ یہ سب باتیں بھی حسن سلوک کے عنوان کے تحت ہیں۔

تیسری بات یہ کہی گئی ہے کہ مہمان کی عزت کرو۔ مہمان کی عزت انبیا کا اسوہ ہے۔ مہمان نوازی کو ایک قدر کی حیثیت حاصل ہے۔ جب کوئی کسی کے ہاں آئے تو اس کو مناسب طریقے سے بٹھانا، اس کے آرام اور کھانے پینے کا

خیال رکھنا، اس کے ساتھ اچھے طریقے سے بات چیت کرنا، یہ سب باتیں مہمان کی عزت کا تقاضا ہیں۔ مہمان نوازی اچھے معاشروں میں ایک قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روایت میں اسے ایمان کے ایک ثمرے کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ اچھی قدر مسلم معاشرے میں بھی جاری رہنی چاہیے۔ دوسری یہ کہ تمام وہ اقدار جو اچھے اخلاق کا مظہر ہیں، اسلام میں بھی پوری طرح مطلوب ہیں۔

ان روایات میں یہ تینوں باتیں جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے کی تاکید کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ اپنی حقیقت میں یہ تینوں چیزیں اعلیٰ اخلاقی رویہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اچھے اخلاق درست ایمان پر دلالت کرتے ہیں اور برے اخلاق ایمان کی کمزوری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی واضح ہوئی کہ اہل ایمان کو جس طرح نماز روزے اور دوسرے شرعی احکام کی پیروی کرنی ہے، اسی طرح انھیں اپنے اندر اچھے اخلاق بھی پیدا کرنے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

متون

امام مسلم رحمہ اللہ نے اس روایت کے چار متن نقل کیے ہیں۔ ان متون میں ترتیب بیان اور لفظ کے تمام فرق آ گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ 'لیصمت' کی جگہ 'لیسکت' بھی آیا ہے۔ 'فلیکرم' کے بجائے 'فلا یؤذی' اور 'فلیحسن الی' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ اسی طرح ترتیب بیان کا فرق بھی امام مسلم کی روایات میں منقول ہے۔ دوسری کتب حدیث میں کچھ اور فرق بھی ہیں۔ ایک فرق تو یہ ہے کہ بعض متون میں ان میں دو یا ایک جزو بیان نہیں ہوا۔ اسی طرح بعض رواۃ نے مہمان نوازی کے حوالے سے اس بات کو بھی اس روایت کا جز بنا دیا ہے کہ مہمان نوازی کا یہ تقاضا کتنے عرصے کے لیے ہے۔

معجم صغیر کی ایک روایت میں 'فلیقل خیرا او لیصمت' کے لیے 'فاذا شهد امرا فلیتکلم فیه بحق' کے الفاظ ہیں۔ معجم کبیر میں 'فلیؤد زکوة ماله' کی تعلیم بھی بیان ہوئی ہے۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام مسلم کے منتخب کردہ متون نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کے زیادہ قریب ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتابیات

موطا، رقم ۱۶۶۰۔ بخاری، رقم ۵۶۷۲، ۵۶۷۳، ۵۷۸۴، ۵۷۸۵، ۵۷۸۷، ۶۱۱۰، ۶۱۱۱۔ مسلم، رقم ۴۷، ۴۸۔

ابوداؤد، رقم ۳۷۴۸، ۵۱۵۴۔ ترمذی، رقم ۱۹۶۷، ۲۵۰۰۔ ابن ماجہ، رقم ۳۶۷۲، ۳۶۷۵۔ احمد، رقم ۶۶۲۱، ۷۶۳۳، ۹۵۹۳، ۹۹۶۸، ۹۹۷۱، ۱۱۷۴۴، ۱۶۴۱۷، ۱۶۴۲۱، ۲۰۳۰۰، ۲۳۵۴۳، ۲۴۴۴۹، ۲۷۲۰۳، ۲۷۲۰۵۔ ابن حبان، رقم ۵۰۶، ۵۱۶، ۵۲۸۷، ۵۵۹۷۔ حاکم، رقم ۷۲۹۶، ۷۲۹۷۔ دارمی، رقم ۲۰۳۵، ۲۰۳۶۔ بیہقی، رقم ۸۹۶۰، ۱۶۴۴۰، ۱۸۴۶۹۔ ابویعلیٰ، رقم ۶۵۹۰۔ معجم صغیر، رقم ۴۷۰۔ معجم کبیر، رقم ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۵۰۱، ۵۱۸۷، ۱۰۸۴۳، ۱۳۵۶۱۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محمد رفیع مفتی

ممنوع نذریں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

روٰی أن النبی صلی اللّٰه علیه و سلم قال[1]: لا نذر و لا یمین[2] فی معصیة اللّٰه عز و جل و لا فیما لا یملك بن آدم و لا فی قطیعة رحم[3] و كفارته كفارة یمین[4].

روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی نذر اور قسم جائز نہیں اللہ بزرگ و برتر کی معصیت (کے کسی کام) میں، نہ اس چیز میں جس کا انسان مالک ہی نہ ہو اور نہ قطع رحمی کے کسی کام میں[1]، (اگر انسان نے اس طرح کے کسی کام میں نذر مانی یا قسم کھائی ہو تو وہ اسے توڑے) اور اس کا کفارہ دے[2] اور اس (نذر) کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے[3]۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ نذر میں انسان خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کوئی عمل کرتا ہے اور قسم میں انسان خدا کو اپنی بات کا گواہ بناتا ہے۔ معصیت کے کسی کام کے ذریعے سے نہ خدا کا شکر ادا کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے کسی ایسے کام پر گواہ بنایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا معصیت کی قسم اور نذر، دونوں ہی ناجائز ہیں۔

اسی طرح یہ بات بھی ضروری ہے کہ انسان جس چیز پر کوئی قسم کھائے یا جس کے بارے میں کوئی نذر مانے، وہ چیز اس کی اپنی ملکیت ہو اور اسے اس پر حق تصرف حاصل ہو، ورنہ وہ اپنی قسم یا نذر پر عمل ہی نہ کر سکے گا۔ چنانچہ دوسرے کی ملکیت کے بارے میں نہ کوئی قسم کھانا جائز ہے اور نہ نذر ماننا۔

قطع رحمی اختیار کرنا، رشتوں کی جڑ پر کلہاڑا چلانا ہے، خدا کے نزدیک یہ سخت گناہ کی بات ہے۔ چنانچہ اس پر قسم کھا لینا یا اس حوالے سے کوئی نذر ماننا، دونوں ہی ممنوع ہیں۔

۲۔ نذر چونکہ آدمی کے ذمے قرض کی طرح واجب الادا ہوتی ہے، اس لیے اگر نا جائز ہونے کی بنا پر وہ نہیں بھی پوری کی جا رہی، تب بھی اس کا کفارہ دینا ہوگا۔

۳۔ قسم کا کفارہ یہ ہے کہ آدمی دس مسکینوں کو اس معیار کا کھانا کھلائے، جو وہ عام طور پر اپنے اہل وعیال کو کھلاتا ہے یا انھیں پہننے کے لیے کپڑے دے یا ایک غلام آزاد کرے، اگر ان میں سے کچھ بھی میسر نہ ہو تو پھر وہ تین دن کے روزے رکھے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ نسائی کی روایت، رقم ۳۸۱۲ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ مضمون یا اس کے کچھ حصے حسب ذیل (۶۴) مقامات پر نقل ہوئے ہیں:

احمد بن حنبل، رقم ۶۹۹۰، ۱۹۸۶۹، ۶۷۳۲، ۱۶۴۳۲، ۱۶۴۳۴، ۱۶۴۳۶، ۲۶۱۴۰، ۲۶۱۴۱، ۱۴۲۰۰؛ ابوداؤد، رقم ۳۲۷۴، ۳۲۷۲، ۳۲۷۳، ۳۲۵۷، ۳۲۹۰، ۳۲۹۲؛ نسائی، رقم ۳۷۹۲، ۳۸۴۹، ۳۸۵۰، ۳۸۵۱، ۳۸۱۳، ۳۸۳۳، ۳۸۳۴، ۳۸۳۵، ۳۸۳۶، ۳۸۳۷، ۳۸۳۸، ۳۸۳۹، ۳۸۴۰، ۳۸۴۱، ۳۸۴۸؛ ابن ماجہ، رقم ۲۱۲۴، ۲۱۲۵؛ دارمی، رقم ۲۳۳۷؛ صحیح ابن حبان، رقم ۴۳۹۱، ۴۳۹۲، ۴۳۵۵؛ بیہقی، رقم ۱۹۸۴۴، ۱۹۸۷۷، ۱۹۶۴۳، ۱۹۶۴۴، ۱۹۶۴۲، ۱۹۸۲۴، ۱۹۶۱۹، ۱۹۸۳۵، ۱۹۷۶۸، ۱۹۸۴۶، ۱۹۸۴۷، ۱۹۸۴۸، ۱۹۸۴۹، ۱۹۸۵۴، ۱۹۸۵۷، ۱۹۸۵۹، ۱۹۸۶۴؛ ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۱۴۵، ۱۲۱۵۷، ۱۲۱۵۸، ۱۲۱۵۴؛ بخاری، رقم ۵۷۰۰؛ مسلم، رقم ۱۱۰، ۱۶۴۱؛ ابویعلیٰ، رقم ۱۵۳۵، ۴۷۸۳؛ ترمذی، رقم ۱۵۲۴، ۱۵۲۵۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۶۹۹۰ میں 'فيما لا يملك بن آدم' (اس چیز میں جس کا انسان مالک ہی نہ ہو) کے الفاظ پہلے آئے اور 'في معصية الله عز و جل' (اللہ بزرگ وبرتر کی معصیت میں) کے الفاظ بعد

میں آئے ہیں، 'و لا فی قطیعة رحم' (اور نہ قطع رحمی میں) کی جگہ 'و لا قطیعة رحم' (اور نہ قطع رحمی میں) کے الفاظ آئے ہیں اور اس میں 'و کفارته کفارة یمین' (نذر کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے) کی جگہ 'فمن حلف علی یمین فرأی غیرها خیرا منها فلیدعها ولیأت الذی هو خیر فإن ترکها کفارتها' (چنانچہ جس نے کوئی قسم کھائی پھر اس سے مختلف بات کو اس سے زیادہ بہتر پایا تو اسے چاہیے کہ وہ قسم کو ترک کر دے اور اس بہتر بات کو اختیار کرے، کیونکہ اس کو ترک کرنا ہی اس کا کفارہ ہے) کے الفاظ موجود ہیں، البتہ اس کی سند میں ضعف ہے، لہٰذا اس میں موجود مختلف بات 'فإن ترکها کفارتها' (کیونکہ اس کو ترک کرنا ہی اس کا کفارہ ہے) کو ہم زیر بحث ہی نہیں لا رہے۔

بعض روایات مثلاً ابوداؤد، رقم ۳۲۷۴ میں 'و کفارته کفارة یمین' (نذر کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے) کی جگہ 'و من حلف علی یمین فرأی غیرها خیرا منها فلیدعها ولیأت الذی هو خیر فإن ترکها کفارتها' (اور جس نے کوئی قسم کھائی پھر اس سے مختلف بات کو اس سے زیادہ بہتر پایا تو اسے چاہیے کہ وہ قسم کو ترک کر دے اور اس بہتر بات کو اختیار کرے کیونکہ اس کو ترک کرنا ہی اس کا کفارہ ہے۔) کے الفاظ موجود ہیں، البتہ اس کی سند میں ضعف ہے، لہٰذا اس میں موجود مختلف بات 'فإن ترکها کفارتها' (کیونکہ اس کو ترک کرنا ہی اس کا کفارہ ہے) کو ہم زیر بحث ہی نہیں لا رہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۳۷۹۲ میں 'فیما لا یملك بن آدم' (اس چیز میں جس کا انسان مالک ہی نہ ہو) کی جگہ 'فیما لا تملك' (اس میں جس کے تم مالک ہی نہیں) کے الفاظ آئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۳۸۱۲ میں 'لا نذر و لا یمین' (کوئی نذر اور قسم جائز نہیں) کے بجائے 'لا نذر' (کوئی نذر جائز نہیں) کے الفاظ ہیں اور 'اللّٰہ عز و جل' (خداے بزرگ و برتر) کے الفاظ کے بجائے 'اللّٰہ' کا لفظ روایت ہوا ہے۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۳۸۵۰ میں 'معصیة اللّٰہ' (اللہ کی نافرمانی) کے بجائے 'معصیة' (نافرمانی) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً دارمی، رقم ۲۳۳۷ میں 'لا نذر و لا یمین' (کوئی نذر اور قسم جائز نہیں) کے بجائے 'لا وفاء لنذر فی معصیة اللّٰہ' (اللہ کی معصیت کے کسی کام میں نذر کا پورا کرنا درست نہیں) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۹۸۶۹ میں 'اللّٰه عز و جل' (اللہ بزرگ و برتر) کے بجائے 'اللّٰه تبارك و تعالیٰ' (اللہ بلند و بابرکت) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن حبان، رقم ۴۳۹۱ میں 'لا نذر و لا یمین فی معصیة اللّٰه عز و جل و لا فیما لا یملك بن آدم' (کوئی نذر اور قسم جائز نہیں اللہ بزرگ و برتر کی معصیت میں، نہ اس چیز میں جس کا انسان مالک ہی نہ ہو) کے بجائے 'لا وفاء لنذر فی معصیة و لا وفاء لنذر فیما لا یملك العبد أو بن آدم' (کسی معصیت میں نذر کو پورا کرنا درست نہیں اور نہ اس چیز میں جس کا بندہ یا انسان مالک ہی نہ ہو) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۱۴۵ میں 'لا یملك بن آدم' (انسان مالک نہ ہو) کے بجائے 'لا یملك العبد' (بندہ مالک نہ ہو) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۶۷۳۲ میں 'لا نذر و لا یمین فی معصیة اللّٰه' (کوئی نذر اور قسم جائز نہیں اللہ کی معصیت میں) کے بجائے 'لا نذر الا فیما ابتغی به وجه اللّٰه' (صرف انھی کاموں کی نذر درست ہے جن سے اللہ کی رضا مطلوب ہوتی ہے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں اور 'و لا فی قطیعة رحم' (اور نہ قطع رحمی میں) کے بجائے 'و لا یمین فی قطیعة رحم' (اور نہ کوئی قسم جائز ہے قطع رحمی میں) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں اور بعض روایات مثلاً ابوداؤد، رقم ۳۲۷۳ میں یہی الفاظ ہیں، لیکن 'ابتغی' (چاہنا) کے بجائے 'یبتغی' (چاہتا ہے) کے الفاظ ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن حبان، رقم ۴۳۹۲ میں 'لا نذر و لا یمین فی معصیة اللّٰه' (کوئی نذر اور قسم جائز نہیں اللہ کی معصیت میں) کے بجائے 'لا وفاء لنذر لابن آدم فی معصیة' (ابن آدم کے لیے کسی معصیت میں کوئی نذر پورا کرنا جائز نہیں) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۸۳۵ میں 'کفارته کفارة یمین' (اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے) کے بجائے 'کفارة النذر کفارة الیمین' (نذر کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۳۸۴۸ میں 'معصیة' (گناہ) کے بجائے 'المعصیة' (گناہ) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۱۵۴ میں 'و لا فیما لا یملك بن آدم' (اور نہ اس چیز میں جس کا

انسان مالک ہی نہ ہو) کے بجائے 'ليس على رجل نذر فيما لا يملك' (آدمی پر اس چیز میں نذر نہیں جس کا وہ مالک ہی نہ ہو) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۴۴ میں زیر بحث روایت سے متعلق الفاظ کے بعد 'و من حلف على يمين فرأى غيرها خيرا منها فليدعها وليأت الذي هو خير فإن تركها كفارتها' (اور جس نے کسی کام کی قسم کھائی پھر اس سے بہتر کوئی کام اس کے سامنے آیا تو اسے چاہیے کہ قسم کو چھوڑ دے اور اس بہتر کام کو اختیار کرے، کیونکہ اسے ترک کرنا ہی اس کا کفارہ ہے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

درج بالا روایت کا مضمون بیہقی، رقم ۱۹۶۴۳ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من طلق ما لا يملك فلا طلاق له ومن أعتق ما لا يملك فلا عتاقة له ومن نذر فيما لا يملك فلا نذر له ومن حلف على معصية الله فلا يمين له ومن حلف على قطيعة رحم فلا يمين له.

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اس (عورت) کو طلاق دی جو اس کے نکاح ہی میں نہیں تو اس کی کوئی طلاق نہیں، جس نے اس غلام کو آزاد کرنے کا حکم دیا جس کا وہ مالک ہی نہیں تو اس کا آزاد کرنا کوئی چیز نہیں، جس نے اس چیز میں نذر مانی جس کا وہ مالک ہی نہیں تو اس کی کوئی نذر نہیں، جس نے اللہ کی معصیت کا کوئی کام کرنے کی قسم کھائی تو اس کی کوئی قسم نہیں اور جس نے قطع رحمی کی قسم کھائی تو اس کی بھی کوئی قسم نہیں۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بعض روایات مثلاً ابن حبان، رقم ۴۳۵۵ میں 'لا نذر ولا يمين في معصية الله عز وجل ولا فيما لا يملك بن آدم ولا في قطيعة رحم' (کوئی نذر اور قسم جائز نہیں اللہ بزرگ و برتر کی معصیت میں، نہ اس چیز میں جس کا انسان مالک ہی نہ ہو اور نہ قطع رحمی میں) کے بجائے 'لا يمين عليك ولا نذر في معصية ولا في قطيعة رحم ولا فيما لا تملك' (تمھارے اوپر معصیت کے کسی کام میں، قطع رحمی میں اور اس چیز میں جس کے تم مالک ہی نہ ہو، نہ کوئی قسم لازم ہے نہ کوئی نذر) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۴۲ میں 'لا نذر ولا يمين' (نہ کوئی نذر اور نہ کوئی قسم) کے الفاظ کے بجائے 'لا يمين ولا نذر' (نہ کوئی قسم اور نہ کوئی نذر) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں اور 'في معصية الله' (اللہ کی معصیت میں) کے بجائے 'فيما يسخط الرب' (جس میں رب ناراض ہوتا ہے) کے الفاظ روایت ہوئے

ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۸۲۴ میں 'معصیة اللّٰه' (اللہ کی معصیت) کے بجائے 'معصیة الرب' (رب کی معصیت) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بخاری، رقم ۵۷۰۰ میں کچھ الفاظ اسی روایت سے متعلق آئے ہیں:

قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم من حلف علی ملة غیر الإسلام فهو كما قال ولیس علی بن آدم نذر فیما لا یملك ومن قتل نفسه بشیء فی الدنیا عذب به یوم القیامة ومن لعن مؤمنا فهو كقتله ومن قذف مؤمنا بكفر فهو كقتله.

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اسلام کے علاوہ کسی ملت پر ہونے کی (جھوٹی) قسم کھائی تو وہ اسی ملت میں شمار ہوگا، انسان پر اس چیز میں کوئی نذر نہیں جس کا وہ مالک ہی نہ ہو، جس نے دنیا میں اپنے آپ کو کسی چیز سے مار ڈالا تو اسے قیامت کے دن اسی چیز سے عذاب دیا جائے گا، جس نے کسی مومن پر لعنت کی تو یہ چیز اسے قتل کر ڈالنے کی مثل ہے اور جس نے کسی مومن پر کفر کا بہتان لگایا تو یہ چیز بھی اس کے قتل ہی کی مثل ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۱۰ میں اس درج بالا حدیث کے الفاظ 'علی ملة غیر الإسلام' (اسلام کے علاوہ کسی ملت پر) کے بجائے 'علی یمین بملة غیر الاسلام كاذبا' (اسلام کے علاوہ کسی ملت پر جھوٹی قسم) کے الفاظ، 'بشیء فی الدنیا' (کسی چیز سے دنیا میں) کے بجائے 'بشیء' (کسی چیز کے ساتھ) کے الفاظ، 'علی بن آدم' (انسان پر) کے بجائے 'علی رجل' (آدمی پر) کے الفاظ ہیں اور 'فیما لا یملك' (اس چیز میں جس کا وہ مالک نہیں) کے بجائے 'فی شیء لا یملكه' (اس چیز میں جس کا وہ مالک نہ ہو) کے الفاظ اور 'ومن لعن مؤمنا فهو' (جس نے مومن پر لعنت کی تو یہ) کے بجائے 'لعن المؤمن' (مومن پر لعنت کرنا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ اس روایت میں مزید 'ومن ادعی دعوی كاذبة لیتكثر بها لم یزده اللّٰه إلا قلة ومن حلف علی یمین صبر فاجرة' (جو شخص اپنا مال بڑھانے کے لیے جھوٹا دعویٰ کرے گا تو اللہ اس کے مال کو کم ہی کرے گا اور جس نے حاکم کے سامنے جھوٹی قسم کھائی (تو وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر غصے ہوگا)) کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ بعض روایات مثلاً ابوداؤد، رقم ۳۲۵۷ میں 'علی ملة غیر الإسلام' (اسلام کے علاوہ کسی ملت

پر) کے بجائے 'بملة غير ملة الاسلام كاذبا' (ملت اسلام کے علاوہ کسی ملت پر جھوٹی) کے الفاظ اور 'فيما لا يملك' (اس چیز میں جس کا وہ مالک نہیں) کے بجائے 'فيما لا يملكه' (اس چیز میں جس کا وہ مالک نہیں) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۳۸۱۳ میں 'على ملة غير الإسلام' (اسلام کے علاوہ کسی ملت پر) کے بجائے 'بملة سوى ملة الاسلام كاذبا' (ملت اسلام کے علاوہ کسی ملت پر جھوٹی) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۶۴۳۲ میں 'يوم القيامة' (قیامت کے دن) کی جگہ 'في الآخرة' (آخرت میں) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں اور 'ومن قذف مؤمنا بكفر' (جس نے کسی مومن پر کفر کی تہمت لگائی) کے بجائے 'من رمى مؤمنا بكفر' (جس نے کسی مومن پر کفر کی تہمت لگائی) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۶۴۳۴ میں 'من حلف على ملة غير الإسلام' (جس نے اسلام کے علاوہ کسی ملت پر ہونے کی قسم کھائی) کے بجائے 'من حلف على يمين بملة سوى الإسلام' (جس نے اسلام کے علاوہ کسی ملت پر ہونے کی قسم کھائی) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۶۴۳۶ میں 'غير الإسلام' (اسلام کے علاوہ) کے بجائے 'سوى الإسلام' (اسلام کے سوا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۱۹ میں 'على ابن آدم' (انسان پر) کے بجائے 'على المؤمن' (مومن پر) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بیہقی، رقم ۱۹۸۶۴ میں زیر بحث روایت کے مضمون کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من نذر نذرا لم يسمه فكفارته كفارة يمين ومن نذر نذرا في معصية الله عز وجل فكفارته كفارة يمين ومن نذر نذرا لم يطقه فكفارته كفارة يمين ومن نذر نذرا فأطاقه فليف به.

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے غیر متعین نذر مانی، اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے، جس نے اللہ بزرگ و برتر کی معصیت میں نذر مانی، اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے، جس نے ایسی نذر مانی جو اس کے بس ہی میں نہیں، اس کا کفارہ بھی وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے، اور جس نے ایسی نذر مانی جسے وہ پورا کر سکتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اسے پورا کرے۔''

مسلم، رقم ۱۶۴۱ میں اسی روایت سے متعلق حصہ درج ذیل واقعے کے سیاق میں لایا گیا ہے:

روی أن أسرت امرأة من الأنصار وأصيبت العضباء فكانت المرأة فی الوثاق وكان القوم يريحون نعمهم بين يدی بيوتهم فانفلتت ذات ليلة من الوثاق فأتت الإبل فجعلت إذا دنت من البعير رغا فتتركه حتی تنتهی إلی العضباء فلم ترغ قال وناقة منوقة فقعدت فی عجزها ثم زجرتها فانطلقت ونذروا بها فطلبوها فأعجزتهم قال ونذرت للّٰه إن نجاها اللّٰه عليها لتنحرنها فلما قدمت المدينة رآها الناس فقالوا العضباء ناقة رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم فقالت إنها نذرت إن نجاها اللّٰه عليها لتنحرنها فأتوا رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم فذكروا ذلك له فقال سبحان اللّٰه بئسما جزتها نذرت للّٰه إن نجاها اللّٰه عليها لتنحرنها لا وفاء لنذر فی معصية ولا فيما لا يملك العبد،...(وفی رواية أخرٰی) لا نذر فی معصية اللّٰه.

''یہ روایت کیا گیا ہے کہ انصار کی ایک عورت گرفتار ہو گئی اور (اس کے ساتھ) عضبا اونٹنی بھی پکڑی گئی۔ (گرفتار کرنے والوں نے) عورت کو باندھا ہوا تھا۔ ایک رات جبکہ وہ لوگ اپنے گھروں کے سامنے جانوروں کو آرام پہنچا رہے تھے، وہ عورت اپنے بندھن سے آزاد ہو گئی اور اونٹوں کے پاس آئی۔ وہ جونہی کسی اونٹ کے قریب جاتی، وہ آواز کرنے لگتا، یہاں تک کہ جب وہ عضبا اونٹنی کے پاس آئی تو اس نے کوئی آواز نہیں نکالی، راوی کہتا ہے کہ وہ بڑی سدھائی ہوئی اونٹنی تھی۔ وہ عورت اس پر سوار ہوئی اور (چلانے کے لیے) اسے ڈانٹا، تو وہ چل پڑی۔ لوگوں کو اس (عورت کے بھاگنے) کی خبر ہو گئی، چنانچہ انھوں نے اسے پکڑنے کے لیے اس کا پیچھا کیا، لیکن عضبا نے ان کو تھکا دیا۔ راوی کہتا ہے کہ اس عورت نے اللہ کے لیے نذر مانی کہ اگر اللہ نے اسے اس اونٹنی کے ذریعے سے نجات دے دی تو وہ ضرور اس کی قربانی کرے گی۔ پھر جب وہ مدینہ پہنچی تو لوگوں نے اسے (اور اس کی اونٹنی کو) دیکھا تو کہنے لگے یہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی عضبا ہے، (لاؤ، اسے ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جائیں) تو اس عورت نے کہا: میں نے یہ نذر مانی ہے کہ اگر اللہ نے مجھے اس اونٹنی کے ذریعے سے نجات دے دی تو میں ضرور اس کی قربانی کروں گی۔ چنانچہ وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ سے یہ بیان کیا تو آپ نے اس عورت سے فرمایا: سبحان اللہ، تو نے اسے کیسا برا

www.javedahmadghamidi.com

بدلہ دیا، تو نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ نے تجھے اس اونٹنی کے ذریعے سے نجات دے دی تو تو اس کو ذبح کر دے گی، (یاد رکھو) کسی معصیت میں نذر کو پورا کرنا درست نہیں، نہ اس چیز میں جس کا بندہ مالک ہی نہ ہو...(اور ایک دوسری روایت میں ہے) اللہ کی معصیت میں کوئی نذر نہیں ہوتی۔''

یہی واقعہ کم وبیش انھی الفاظ میں بیہقی، رقم ۱۹۸۷۷ میں بھی بیان ہوا ہے۔

۲۔'و لا یمین' کے الفاظ احمد بن حنبل، رقم ۶۹۹۰ سے لیے گئے ہیں۔

۳۔'و لا فی قطیعة رحم' کے الفاظ سنن البیہقی، رقم ۱۹۶۴۴ سے لیے گئے ہیں۔

۴۔'و کفارته کفارة یمین' کے الفاظ سنن ابی داؤد، رقم ۳۲۹۰ سے لیے گئے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ایمانیات

(۱۵)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

نبی کی ریاضت

نبی جس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے مبعوث کیے جاتے ہیں، اس کے لحاظ سے عبادت و ریاضت میں بعض اوقات ان سے زیادہ اہتمام کا تقاضا کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود جمعیت خاطر بھی ہوتی ہے۔ تبتل الی اللہ کے ذریعے سے قلب و نظر کی تطہیر بھی اور علم و عمل میں استقامت بھی۔ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن کا بیان ہے کہ انھیں جب تورات کی الواح دینے کا فیصلہ کیا گیا تو اس سے پہلے وہ اس بار عظیم کو اٹھانے کے لیے ذہنی اور قلبی تیاریوں کی غرض سے چالیس دن تک جبل طور پر معتکف رہے۔[۶۷] سیدنا یحییٰ اور سیدنا مسیح نے رہبانیت کی حد تک زہد و تجرد اختیار کیے رکھا، اس لیے کہ زندگی کا ایک ایک لمحہ وہ اس قوم پر اتمام حجت کی جدوجہد میں صرف کرنا چاہتے تھے، جس کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی مقصد سے ہر سال اعتکاف کرتے اور وقتاً فوقتاً روزے رکھتے تھے۔ آپ کو انذار عام کا حکم دیا گیا تو پانچ نمازوں کے ساتھ مزید ایک نماز آپ پر فرض کر دی گئی۔ اس کے لیے تہجد کا وقت مقرر کیا گیا اور آپ کو ہدایت کی گئی کہ آدھی سے کچھ کم یا زیادہ رات تک اس میں قرآن کی تلاوت کریں۔[۶۸] سورۂ بنی اسرائیل میں اس کا حکم آپ کے لیے 'وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ' (اور رات میں تہجد کا اہتمام کرو،

---

۶۷ الاعراف ۷: ۱۴۲-۱۴۵۔

یہ تمھارے لیے مزید برآں ہے) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اسی طرح مزمل میں فرمایا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ، قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا، نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا، اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا، اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا، اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا، اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا، وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا. (۷۳:۱-۸)

''اے اوڑھ لپیٹ کر بیٹھنے والے، رات کو کھڑے رہو، مگر تھوڑا۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو یا اس پر کچھ بڑھا دو، اور (اپنی اس نماز میں) قرآن کو ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔ اِس لیے کہ عنقریب ایک بھاری بات کا بوجھ ہم تم پر ڈال دیں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ رات کا اٹھنا دل کی جمعیت اور بات کی درستی کے لیے بہت موزوں ہے۔ اس لیے کہ دن میں تو (اِس کام کی وجہ سے) تمھیں بہت مصروفیت رہے گی۔ (لہٰذا اِس وقت پڑھو) اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرو، اور (رات کی اس تنہائی میں) سب سے ٹوٹ کر اُسی کے ہو رہو۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

نبی کی فضیلت

نبی کو ایک عمومی فضیلت تمام انسانوں پر حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ انبیا علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد ایک جگہ فرمایا ہے: 'وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَی الْعٰلَمِیْنَ'[۶۹] (اور اِن میں سے ہر ایک کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت دی تھی)۔ لیکن قرآن کا بیان ہے کہ اس کے ساتھ ایک خصوصی فضیلت ان میں سے بالخصوص رسولوں کو کسی نہ کسی پہلو سے ایک دوسرے پر بھی حاصل ہوتی ہے اور اس کے اعتبار سے وہ دوسروں پر ممتاز ہوتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ، مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ، وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ، وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ، وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ. (البقرہ ۲:۲۵۳)

''یہ جو رسول ہیں، ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی، اس طرح کہ ان میں سے کسی سے اللہ خود ہم کلام ہوا اور کسی کے درجے اس نے (بعض دوسری حیثیتوں سے) بلند کیے اور (آخر میں) مریم کے بیٹے عیسیٰ کو نہایت واضح نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی۔''

۶۸؎ بنی اسرائیل ۱۷:۷۹۔

۶۹؎ الانعام ۶:۸۶۔

اس سے واضح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا۔ یہ ان کی فضیلت کا خاص پہلو ہے۔ مسیح علیہ السلام کو کھلے کھلے معجزات دیے اور روح القدس سے ان کی تائید فرمائی۔ یہ ان کے مخصوصات میں سے ہے۔ دوسرے پیغمبروں کے درجات و مراتب کو بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعلق فرمایا ہے:

فضلت علی الانبیاء بست: اعطیت جوامع الکلم، و نصرت بالرعب، و احلت لی الغنائم، و جعلت لی الارض طهورا و مسجدًا، و ارسلت الی الخلق کافة، و ختم بی النبیون. (مسلم، رقم ۵۲۳)

''مجھے چھ باتوں میں نبیوں پر فضیلت دی گئی ہے: (۱) مجھے جامع اور مختصر بات کہنے کی صلاحیت دی گئی۔ (۲) مجھے رعب کے ذریعے سے نصرت بخشی گئی۔ (۳) میرے لیے مال غنیمت حلال کیا گیا۔ (۴) میرے لیے زمین کو مسجد بنایا گیا اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہے[۰]۔ (۵) مجھے تمام دنیا کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا۔ (۶) میرے اوپر نبوت ختم کر دی گئی۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

انبیا و رسل کی فضیلت کے باب میں صحیح رویہ یہی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض موقعوں پر لوگوں کو اس معاملے میں متنبہ بھی فرمایا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابی نے آپ کو 'یا خیر البریة' (اے بہترین خلائق) کہہ کر خطاب کیا۔ آپ نے فرمایا: وہ تو ابراہیم علیہ السلام تھے[1]۔ ایک موقع پر پوچھا گیا کہ لوگوں میں سب سے معزز کون ہے؟ فرمایا: یوسف پیغمبر بن پیغمبر بن پیغمبر بن ابراہیم خلیل اللہ[2]۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ کسی مسلمان نے اپنی قسم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا والوں پر فضیلت کا ذکر کیا تو ایک یہودی نے جواب میں کہا: اس ذات کی قسم، جس نے موسیٰ کو دنیا والوں پر فضیلت دی ہے۔ مسلمان نے یہ سنا تو اسے غصہ آ گیا اور اس نے یہودی کو ایک تھپڑ کھینچ مارا۔ یہودی نے حضور کی خدمت میں جا کر شکایت کی تو آپ نے فرمایا: مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دو۔ قیامت کے دن میں ہوش میں آؤں گا تو وہ عرش کا کونا پکڑے ہوئے ہوں گے۔ شاید بے ہوش نہیں ہوں گے، یا مجھ سے پہلے ہوش میں آ جائیں گے[3]۔

یہ تعلیم اس قدر واضح ہے، لیکن انبیا علیہم السلام کی امتوں نے بالعموم اسے قبول نہیں کیا، بلکہ اس کی جگہ ایک بالکل

---

[۰] مطلب یہ ہے کہ میری شریعت میں نماز صرف مخصوص عبادت گاہوں ہی میں نہیں، بلکہ روے زمین پر ہر جگہ پڑھی جا سکتی ہے اور پانی نہ ملے تو تیمّم کر کے وضو اور غسل، دونوں کی ضرورت بھی پوری کی جا سکتی ہے۔

[1] مسلم، رقم ۲۳۶۹۔

[2] بخاری، رقم ۳۳۸۳۔

[3] بخاری، رقم ۳۴۰۸۔

غلط رویہ اختیار کرلیا جس کی وجہ سے ان کے درمیان تعصّبات کی دیواریں کھڑی ہوگئیں اور وہ ایک دوسرے کے دشمن ہو کر باہم جنگ وجدل میں مبتلا ہوئے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...ان انبیا کی امتوں نے جو روش اختیار کی، وہ یہ ہے کہ ان میں سے جس نے جس نبی و رسول کو مانا، سارے فضائل وخصوصیات کا جامع تنہا اسی کو بنا کر رکھ دیا اور دوسرے کسی نبی و رسول کے لیے کسی فضیلت کا تسلیم کرنا ان کے نزدیک ایمان کے منافی قرار پا گیا۔ اس تعصب و تنگ نظری کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلی امتوں میں سے ہر امت اپنے اپنے خول میں بند ہو کر رہ گئی اور اس کے لیے دوسرے نبیوں اور رسولوں کی برکات سے فائدہ اٹھانے کی راہ مسدود ہوگئی۔ اگر وہ صحیح روش اختیار کرتیں تو ہر رسول ان کا رسول اور ہر ہدایت ان کی ہدایت ہوتی اور وہ اس ہدایت میں سے بھی حصہ پاتیں جو اب قرآن مجید کی صورت میں آخری ہدایت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے ظاہر ہوئی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ بنی اسرائیل میں بھی اشارہ فرمایا ہے: وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ، وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا [۴۷] (اور ہم نے انبیا میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عنایت کی)۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۵۸۳)

نبی کی اطاعت

نبی کو نبی مان لینے کا لازمی نتیجہ ہے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنی کتاب میں خود واضح فرما دی ہے کہ نبی صرف عقیدت ہی کا مرکز نہیں، بلکہ اطاعت کا مرکز بھی ہوتا ہے۔ وہ اس لیے نہیں آتا کہ لوگ اس کو نبی اور رسول مان کر فارغ ہو جائیں۔ اس کی حیثیت صرف ایک واعظ و ناصح کی نہیں، بلکہ ایک واجب الاطاعت ہادی کی ہوتی ہے۔ اس کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں جو ہدایت وہ دے، اس کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ. (النساء ۴: ۶۴)	''اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔''

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ براہ راست معاملہ نہیں کرتا۔ وہ اپنی ہدایت نبیوں اور رسولوں کی وساطت سے دیتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اصلی مقصود تو خدا کی اطاعت ہے، مگر اس کا طریقہ ہی یہ ہے کہ اس کے نبیوں کی اطاعت کی جائے۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ، فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ [۴۸] (جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے

---

۴۷ ے ۱۷: ۵۵۔

۴۸ ے النساء ۴: ۸۰۔

درحقیقت خدا کی اطاعت کی ہے) اور اس مضمون کی دوسری آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہی حقیقت بیان فرمائی ہے۔ پھر اس کی یہ آخری حد بھی واضح کر دی ہے کہ اپنے درمیان پیدا ہونے والی نزاعات تک میں نبی کے فیصلے کو بے چون و چرا اور پورے اطمینان قلب کے ساتھ ماننا ضروری ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ، لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ، ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ، وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا. (النساء۴: ۶۵)

''تیرے پروردگار کی قسم، یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے، جب تک اپنے اختلافات میں تمھی کو حکم نہ مانیں اور جو فیصلہ تم کر دو، اپنے دلوں میں تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے اپنے سر نہ جھکا دیں۔''

استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے، جب تک یہ اپنے درمیان پیدا ہونے والی تمام نزاعات میں تمھی کو حکم نہ مانیں اور پھر ساتھ ہی ان کے اندر یہ ذہنی تبدیلی نہ واقع ہو جائے کہ وہ تمھارے فیصلے کو بے چون و چرا پورے اطمینان قلب کے ساتھ مانیں اور اپنے آپ کو بلا کسی استثنا و تحفظ کے تمھارے حوالے کر دیں۔ رسول کی اطاعت خود خدا کی اطاعت کے ہم معنی ہے، اس وجہ سے اس کا حق صرف ظاہری اطاعت سے ادا نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے دل کی اطاعت بھی شرط ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۳۲۹)

لہٰذا یہ اطاعت کوئی رسمی چیز نہیں ہے۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ یہ اتباع کے جذبے سے اور پورے اخلاص، پوری محبت اور انتہائی عقیدت و احترام سے ہونی چاہیے۔ انسان کو خدا کی محبت اسی اطاعت اور اسی اتباع سے حاصل ہوتی ہے:

قُلْ: اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ، يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ، وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (آل عمران ۳: ۳۱)

''ان سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا اور (یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ) اللہ بخشنے والا ہے، اس کی شفقت ابدی ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حقیقت خود بھی مختلف طریقوں سے واضح فرمائی ہے۔ ایک روایت میں آپ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ کسی شخص کا ایمان اس وقت تک متحقق نہیں ہو سکتا، جب تک وہ مجھے اپنے باپ بیٹوں اور دوسرے تمام لوگوں سے عزیز تر نہ رکھے۔[۶]

سورۂ حجرات میں مدینہ کے گرد و نواح سے آنے والے بدوی قبائل کے لوگوں کو خطاب کر کے بارگاہ رسالت

۶؎ بخاری، رقم ۱۵۔ مسلم، رقم ۴۴۔

www.javedahmadghamidi.com

کے جو آداب بتائے گئے ہیں، وہ نبی کے اس مرتبے کو ہر لحاظ سے واضح کر دیتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ، اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ، وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ، اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ، وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ، اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى، لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ. (۴۹: ۱-۳)

''ایمان والو، اللہ اور اس کے رسول کے سامنے اپنی رائے کو مقدم نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ سمیع و علیم ہے۔ ایمان والو، اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ نبی کو اونچی آواز سے پکارو، جس طرح تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمھارے اعمال اکارت ہو جائیں اور تمھیں خبر بھی نہ ہو۔ (یاد رکھو کہ) جو لوگ نبی کے سامنے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں، وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی افزایش کے لیے منتخب کیا ہے۔ اُن کے لیے مغفرت بھی ہے اور اجر عظیم بھی۔''

استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ اس صحیح ادب کی تعلیم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں ہر صاحب ایمان کو اختیار کرنا لازم ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے رسول کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں، درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی افزایش کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ لفظ 'امتحن' یہاں 'اصطفی' یا اس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر دل تقویٰ کی تخم ریزی اور اس کی افزایش کے لیے موزوں نہیں ہوتا، بلکہ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ امتحان کر کے دلوں کا انتخاب کرتا ہے، اور اس انتخاب میں اصل چیز جو ترجیح دینے والی بنتی ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر اللہ و رسول کے لیے انقیاد و اطاعت کا سچا جذبہ اور ان کے آگے فروتنی کا صحیح شعور ہے یا نہیں۔ یہ چیز جس کے اندر جتنی ہی زیادہ ہوتی ہے، اس کو اتنی ہی زیادہ تقویٰ کی نعمت عطا ہوتی ہے اور جو لوگ جس درجے میں اس شعور سے عاری ہوتے ہیں، وہ اتنے ہی تقویٰ سے بعید ہوتے ہیں۔ آواز بلند کرنے کا ذکر، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، انسان کے باطن کے ایک مخبر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ جو شخص کسی کی آواز پر اپنی آواز بلند رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اس کا یہ عمل شہادت دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے اونچا خیال کرتا ہے۔ یہ چیز اکتساب فیض کی راہ بالکل بند کر دیتی ہے۔ اگر استاد کے آگے کسی شاگرد کا یہ طرز عمل ہو تو وہ اس کے فیض سے محروم رہتا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ کے رسول کے آگے کسی نے یہ روش اختیار کی تو وہ صرف رسول ہی کے فیض سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بھی محروم ہو جائے گا، اس لیے کہ رسول اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوتا ہے۔''

(تدبر قرآن ۷/ ۴۸۹)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

نبی کی شفاعت

نبی کا اصلی فریضہ انذار و بشارت ہے، مگر اس کے ساتھ وہ خدا کے حضور میں بندوں کی شفاعت بھی کرتا ہے۔ شفاعت کیا ہے؟ بندہ جب مغفرت چاہتا ہے تو اس کے ساتھ ہو کر یہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی درخواست ہے۔ شفاعت کا اصل مفہوم یہی ہے۔ لہٰذا بندے کی طرف سے توبہ و استغفار کے بغیر اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ شفاعت کرنے والا استغفار میں فرد ثانی اور مغفرت چاہنے والے کی زبان ہوتا ہے اور دعا و مناجات اور خضوع و تذلل میں اس کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ: تَعَالَوۡا، يَسۡتَغۡفِرۡ لَكُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ، لَوَّوۡا رُءُ وۡسَهُمۡ، وَرَاَيۡتَهُمۡ يَصُدُّوۡنَ، وَهُمۡ مُّسۡتَكۡبِرُوۡنَ. (المنافقون ۶۳: ۵)

''اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ، اللہ کا رسول تمھارے لیے مغفرت کی دعا کرے تو سر جھٹکتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ وہ بڑے غرور کے ساتھ اعراض کرتے ہیں۔''

اس کا پہلا موقع اس وقت آتا ہے، جب بندہ ایمان لاتا ہے اور نبی اس کے لیے استغفار کرتا ہے۔ دوسرا موقع وہ ہوتا ہے، جب وہ گناہ کر بیٹھتا ہے اور تائب ہو کر خدا سے مغفرت چاہتا ہے۔ زمانۂ رسالت کے منافقین کو اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ نصیحت فرمائی ہے کہ وہ اگر اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں تو خود بھی مغفرت کی دعا کریں اور پیغمبر سے بھی اس کی درخواست کریں۔ ان کا یہ رجوع خدا کی رحمت کو ان کی طرف متوجہ کرنے کا باعث بنے گا۔ فرمایا ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ، وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡٓا اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ، فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ، وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ، لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا. (النساء ۴: ۶۴)

''اور اگر انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تمھاری خدمت میں حاضر ہوتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی چاہتا تو یقیناً اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جگہ جگہ بندوں کو توبہ و استغفار کی دعوت دی ہے۔ فرمایا ہے کہ میرے بندو، تم نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ہے تو میری رحمت سے مایوس نہ ہو۔ تمھارا پروردگار غفور و رحیم ہے، تم اس کی طرف رجوع کرو گے تو وہ تمھارے تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ یاد رکھو، ایمان والے اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتے[۷۷]۔ پھر توبہ و استغفار کے لیے اپنی یہ سنت بھی واضح کر دی ہے کہ گناہ کے بعد جتنی جلدی ممکن ہو، توبہ کر لینی چاہیے۔ اس لیے کہ اللہ

۷۷؎ الزمر ۳۹: ۵۳۔ یوسف ۱۲: ۸۷۔

www.javedahmadghamidi.net
www.ghamidi.net

پر صرف انھی لوگوں کی توبہ کا حق قائم ہوتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں، پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ ان لوگوں کی توبہ اللہ کے نزدیک کوئی توبہ نہیں جو زندگی بھر گناہوں میں ڈوبے رہتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ موت سر پر آن کھڑی ہوئی ہے تو توبہ کا وظیفہ پڑھنے لگتے ہیں[۸]۔

اس میں غور کیجیے تو ان لوگوں کے حال پر اللہ تعالیٰ نے خاموشی اختیار فرمائی ہے جو گناہ کے بعد جلد ہی توبہ کر لینے کی سعادت تو حاصل نہیں کر سکے، لیکن اتنی دیر بھی نہیں کی کہ موت کا وقت آن پہنچا ہو۔ یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں شفاعت کی توقع ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس کا اثبات کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ان غلط تصورات کی تردید بھی پوری صراحت سے کر دی ہے جو لوگوں نے شفاعت کے بارے میں قائم کر رکھے ہیں اور جن سے خدا کے عدل اور جزا و سزا کے وجوب کی نفی ہوتی ہے۔

پہلی بات یہ فرمائی ہے کہ شفاعت کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص بھی شفاعت نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ اس کے مقرب فرشتے بھی اپنی طرف سے آگے بڑھ کر کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے پہلے خدا کو راضی کرنا ضروری ہے تا کہ شفاعت کا اذن ملے اور وہ قبول بھی ہو جائے:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ، قُلْ: اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا، وَّلَا يَعْقِلُوْنَ. قُلْ: لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا، لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ. (الزمر ۳۹: ۴۳-۴۴)

”کیا انھوں نے خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ ان سے کہو: کیا وہ شفاعت کریں گے، خواہ اُن کے اختیار میں کچھ نہ ہو اور وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں؟ کہہ دو کہ شفاعت تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ زمین و آسمان کی بادشاہی اسی کی ہے۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

وَقَالُوا: اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا، سُبْحٰنَهٗ، بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ، لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ، وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ. (الانبیاء ۲۱: ۲۶-۲۷)

”اور یہ کہتے ہیں کہ رحمٰن کے اولاد ہے، سبحان اللہ، وہ تو (اُس کے) مقرب بندے ہیں۔ وہ اس کے حضور کبھی بڑھ کر نہیں بولتے اور اس کے حکم ہی کی تعمیل کرتے ہیں۔“

دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ اذن الٰہی کے بعد بھی اسی کے بارے میں زبان کھولنے کی اجازت ہوگی جس کے لیے اللہ پسند فرمائے گا۔ کوئی شخص اپنی مرضی سے کسی کے متعلق کوئی بات نہ کر سکے گا:

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ، وَلَا

”وہ اُن کے آگے اور پیچھے کی ہر چیز سے واقف ہے،

۸؎ النساء ۴: ۱۷-۱۸۔

يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى، وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ. (الانبياء۲۱:۲۸)

اور وہ کسی کی شفاعت نہ کریں گے، سوائے اُس کے جس کے حق میں اللہ راضی ہو، اور وہ اس کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں۔''

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ، اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ، وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا، يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ، وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا. (طٰہٰ۲۰:۱۰۹-۱۱۰)

''اُس روز شفاعت نفع نہ دے گی، الا یہ کہ کسی کو رحمٰن اس کی اجازت دے اور کسی کے لیے کوئی بات سننا پسند کرے۔ وہ اُن کے آگے اور پیچھے کی ہر چیز سے باخبر ہے اور اُن کا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔''

تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ جس کے لیے اللہ پسند فرمائے گا، اس کے متعلق بھی وہی بات کہی جائے گی جو ہر لحاظ سے صحیح ہوگی:

لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ، وَقَالَ صَوَابًا. (النبا۷۸:۳۸)

''(اُس دن، جب) وہی بولیں گے جنھیں رحمٰن اجازت دے اور وہ صحیح بات کہیں۔''

شفاعت کے بارے میں یہ قرآن کا نقطۂ نظر ہے۔ اس سلسلہ کی روایتوں کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہیے اور اس سے کوئی چیز متجاوز نظر آئے تو اسے راویوں کے تصرفات سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہیے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ختم نبوت

نبی ہر قوم میں اور صدیوں تک آتے رہے ہیں، لیکن یہ سلسلہ اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ اس کی ابتدا آدم علیہ السلام سے ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ ذریت ابراہیم کی ایک شاخ بنی اسمٰعیل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور قرآن نے اعلان کر دیا کہ آپ آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد اب کوئی نبی اور رسول نہیں آئے گا۔ یہ بات اگرچہ انبیا علیہم السلام کی پیش گوئیوں سے بھی واضح تھی، لیکن قرآن میں اس کے ذکر کا موقع اس وقت پیدا ہوا، جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو زید رضی اللہ عنہ کی مطلقہ سے شادی کرنے کا حکم دیا۔ یہ حکم منہ بولے بیٹوں کے معاملے میں جاہلیت کی ایک رسم کی اصلاح کے لیے دیا گیا تھا۔ چنانچہ فرمایا کہ آپ چونکہ آخری پیغمبر ہیں، اس وجہ سے ضروری تھا کہ آپ ہی کے ذریعے سے اس رسم بد کی اصلاح کی جائے۔ آپ کے بعد اگر کوئی اور نبی آنے والا ہوتا تو ہو سکتا تھا کہ اللہ اس معاملے کو آیندہ کے لیے اٹھا رکھتا۔ لیکن اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اس لیے یہ ذمہ داری آپ ہی کو پوری کرنی ہے:

مَـا كَـانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ، وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ، وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ، وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمًا. (الاحزاب ۳۳:۴۰)

''محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

اس آیت میں لفظ 'خاتم النبیین' استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ 'خاتم' بکسر التاء نہیں، بلکہ 'خاتم' بفتح التاء ہے۔ اس کے معنی عربی زبان میں مہر کے ہیں۔ مہر کسی چیز کو بند کرنے کے لیے ہوتی ہے یا کسی چیز کی تصدیق کے لیے۔ 'مہر بند کرنا' اور 'مہر تصدیق ثبت کرنا'، یہ دونوں محاورے اسی سے وجود میں آئے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں 'خاتم النبیین'، یعنی نبیوں کی مہر، قرار دیا گیا ہے۔ یہ لفظ جس سیاق میں اور جس موقع پر آیا ہے، اس سے واضح ہے کہ یہاں یہ پہلے معنی میں ہے اور آیت کا مدعا یہ ہے کہ آپ کے ذریعے سے سلسلۂ نبوت کو مہر بند کر دیا گیا ہے۔ اب کسی نبی یا رسول کے آنے کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ یہ وہی مفہوم ہے جسے ہم انگریزی زبان میں Seal of the Prophets کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔ تاہم کوئی شخص اگر اسے مہر تصدیق ہی کے معنی میں لینے پر اصرار کرتا ہے اور بر سبیل تنزل ہم اسے مان لیتے ہیں تو اس کا نتیجہ بھی وہی ہوگا۔ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ کی تصدیق کے بغیر کسی شخص کی نبوت نہیں مانی جا سکتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ آپ سے پہلے کے نبیوں کو ہم آپ ہی کی تصدیق سے مانتے ہیں، مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے بعد آنے والے کسی نبی کی نہ آپ نے بشارت دی ہے، نہ تصدیق فرمائی ہے۔ بلکہ نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں بار بار اعلان کیا ہے کہ آپ آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ پھر یہی نہیں، اس سے آگے یہ بات بھی آپ نے واضح کر دی ہے کہ نبوت کا منصب ہی ختم نہیں ہوا، اس کی حقیقت بھی ختم ہو گئی ہے، لہٰذا اب کسی شخص کے لیے نہ وحی والہام کا امکان ہے اور نہ مخاطبہ ومکاشفہ کا۔ ختم نبوت کے بعد اس طرح کی سب چیزیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

آپ کے ارشادات درج ذیل ہیں:

۱۔ كانت بنو اسرائيل تسوسهم الانبياء، كلما هلك نبي خلفه نبي، وانه لا نبي بعدي، وسيكون خلفاء. (بخاری، رقم ۳۴۵۵)

''بنی اسرائیل کی قیادت اُن کے نبی کرتے تھے۔ ایک نبی دنیا سے رخصت ہوتا تو دوسرا اس کا جانشین بن جاتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، بلکہ خلفا ہوں گے۔''

۲۔ مثلي و مثل الانبياء من قبلي، كمثل رجل بنى بيتاً، فاحسنه واجمله الاموضع لبنة من زاوية، فجعل الناس

''میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے نبیوں کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک شخص نے عمارت بنائی، نہایت حسین وجمیل، مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی

يطوفون به، ويعجبون له و يقولون: هلا وضعت هذه اللبنة؟ قال: فانا اللبنة، وانا خاتم النبيين.

(بخاری، رقم ۳۵۳۵)

جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہار حیرت کرتے تھے، مگر کہتے تھے کہ یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی گئی۔ فرمایا کہ وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔''

۳۔ لم يبق من النبوة الاالمبشرات. قالوا: وما المبشرات؟ قال: الرؤيا الصالحة. (بخاری، رقم ۶۹۹۰)

''نبوت میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی، صرف بشارت دینے والی باتیں رہ گئی ہیں۔ عرض کیا گیا: وہ بشارت دینے والی باتیں کیا ہیں؟ فرمایا: اچھا خواب۔''

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محمد عمار خان ناصر / حافظ حسن مدنی

[مسجد اقصیٰ کی تولیت]

جناب عمار خان ناصر اور مدیر ''محدث'' کے مابین مراسلت

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

[مسجد اقصیٰ کی تولیت کے موضوع پر یہ ''المورد'' کے شعبۂ تصنیف و تالیف کے رکن اور مدیر ماہنامہ ''الشریعہ'' جناب عمار خان ناصر اور ماہنامہ ''محدث'' کے مدیر جناب حافظ حسن مدنی کے مابین ہونے والی مراسلت ہے۔ اس سلسلے کا اولین مراسلہ اگرچہ گزشتہ شمارے میں شائع ہو چکا ہے، مگر سلسلۂ کلام کی تفہیم کے پیش نظر یہاں اسے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ مراسلت سے پہلے جناب عمار خان ناصر کا ایک وضاحتی نوٹ بھی شامل اشاعت ہے۔ مدیر]

جناب عمار خان ناصر کی ایک وضاحت

''اشراق'' کے گزشتہ شمارے میں ماہنامہ ''محدث'' کے مدیر حافظ حسن مدنی صاحب کے نام میرا ایک مکتوب شائع ہوا ہے۔ یہ مکتوب ۱۷ مارچ ۲۰۰۷ کو لکھا گیا تھا جس کا جواب مدیر ''محدث'' کی طرف سے مجھے ۲۵ مارچ کو موصول ہوا اور دو تین مزید خطوط کے تبادلے کے بعد یہ مراسلت زیر بحث نکتے کی حد تک مکمل ہو گئی۔ میں اپنا پہلا خط ۱۷ مارچ کو ''اشراق'' میں اشاعت کے لیے بھیج چکا تھا۔ ۲۵ مارچ کو مدیر ''محدث'' کا جواب موصول ہونے پر میں نے فوری طور پر مدیر ''اشراق'' سے رابطہ کیا اور ان سے گزارش کی کہ اگر ممکن ہو تو وہ پوری مراسلت کو یکجا شائع کرنے کے لیے گنجایش پیدا کریں، ورنہ میرا خط بھی آیندہ شمارے کے لیے موخر کر دیں، لیکن اس وقت تک ''اشراق'' چھپ چکا تھا،

چنانچہ اس سلسلۂ مراسلت کے باقی خطوط کو اپریل کے شمارے میں جگہ نہ مل سکی۔ ''اشراق'' کا یہ شمارہ ملتے ہی مدیر ''محدث'' نے فون پر مجھ سے رابطہ کیا اور اس بات پر شکوہ کیا کہ میں نے اپنا خط ''اشراق'' میں اشاعت کے لیے کیوں بھیجا ہے۔ ان کے بقول وہ ''اشراق'' کے ساتھ مکالمہ یا افہام وتفہیم پر مبنی بحث کے قائل نہیں ہیں، اس لیے یہ بحث ''الشریعہ'' اور ''محدث'' تک محدود رہنی چاہیے تھی۔ میں نے واضح کیا کہ میری تحریریں ''الشریعہ'' کے ساتھ ساتھ ''اشراق'' میں بھی باقاعدگی سے شائع ہوتی ہیں اور اس تحریر کا ''اشراق'' میں چھپنا کوئی نئی بات نہیں، تاہم اگر ''اشراق'' میں میرا خط چھپنے سے آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے تو میں اس پر معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے بے حد، بے حد افسوس ہے کہ موقر معاصر نے اس بات کو ایک بالکل غلط رنگ دیتے ہوئے اپریل ۲۰۰۷ کے شمارے میں یہ الزام عائد کیا ہے کہ: ''’اشراق‘ کا رویہ صحافتی بد دیانتی کی زندہ مثال ہے کہ انھوں نے ’اشراق‘ کے شمارۂ اپریل میں صرف اپنے تیار کردہ محقق کے خط کو من وعن شائع کرنے پر ہی اکتفا کیا ہے جبکہ جناب محمد عمار ناصر نے نہ صرف مجلّہ ’اشراق‘ کو دوطرفہ خطوط مہیا کیے بلکہ ان کے بقول انھیں اکٹھا شائع کرنے کی تاکید بھی کی تھی۔ اشراق کے اس رویہ کی محمد عمار خان ناصر نے باضابطہ معذرت کرتے ہوئے اسے باعث افسوس قرار دیا ہے۔''(۹۱)

میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ’محدث‘ کا مذکورہ بیان سراسر ’محدثانہ‘ ہے۔ موقر معاصر کو اس سطح پر کیوں اترنا پڑا؟ قارئین اس کا اندازہ اس مراسلت اور بالخصوص اس کے آخری خطوط سے بخوبی کر سکیں گے۔ [عمار ناصر]

جناب عمار خان ناصر اور مدیر ''محدث'' کے مابین مراسلت

— ۱ —

برادر محترم حافظ حسن مدنی صاحب، مدیر ماہنامہ ''محدث'' لاہور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے، مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

''محدث'' کے مارچ ۲۰۰۷ کے شمارے میں ''مسجد اقصیٰ صیہونیوں کے نرغے میں'' کے زیر عنوان آپ کا تفصیلی اور معلوماتی اداریہ پڑھنے کو ملا اور اس بات پر خوشگوار حیرت ہوئی کہ میں نے ''الشریعہ'' کے ستمبر/اکتوبر ۲۰۰۳ اور اپریل/مئی ۲۰۰۴ کے شماروں میں شائع ہونے والی اپنی تفصیلی تحریروں میں شرعی زاویۂ نگاہ سے اس معاملے کے جس

بنیادی پہلو کی طرف اہل علم کی توجہ مبذول کرائی تھی، آپ کی تازہ تحریر میں اس کو تسلیم کرتے ہوئے مسجد اقصیٰ کے حوالے سے ایک ایسا موقف اختیار کیا گیا ہے جو امت مسلمہ کے مروجہ جذباتی، غیر اخلاقی اور غیر شرعی موقف سے بالکل مختلف ہے اور جس سے، صورت حال کے واقعی تجزیے اور حکمت عملی کے بعض پہلووں سے قطع نظر، کوئی اصولی اختلاف غالباً نہیں کیا جا سکتا۔ میری پوری بحث کا حاصل یہی تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تعمیر کردہ ہیکل سے، جسے قرآن مجید نے ''مسجد اقصیٰ'' کے نام سے یاد کیا ہے، بنی اسرائیل کے حق تولیت کو از روے شریعت منسوخ قرار دینے کا تصور اور اس کی بنیاد پر تقریباً ۱۵۰۰ فٹ لمبے اور ۱۰۰۰ فٹ چوڑے موجودہ احاطۂ ہیکل (Temple Mount) کے پورے رقبے اور بالخصوص اس کے وسط میں موجود صخرۂ بیت المقدس اور اس پر اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان کے تعمیر کردہ 'قبۃ الصخرۃ' کو بلا شرکت غیرے مسلمانوں کی ملکیت قرار دینے کا دعویٰ شرعی و اخلاقی لحاظ سے درست نہیں، اس لیے مسلمانوں کو اپنا دعویٰ استحقاق تاریخی و واقعاتی بنیاد پر اس احاطے کی جنوبی دیوار کے ساتھ قائم اس مسجد تک محدود رکھنا چاہیے جہاں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فتح بیت المقدس کے موقع پر نماز ادا کر کے اسے مسلمانوں کی عبادت کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ (یہ مسجد خود سیدنا عمر نے تعمیر نہیں فرمائی تھی، بلکہ بعد کے دور میں مسلمانوں کی تعمیر کردہ ہے۔ ابتدا میں اسے 'مسجد عمر' کا نام دیا گیا تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہ 'مسجد اقصیٰ' ہی کے نام سے معروف ہو گئی، جو ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی ذکر کردہ 'مسجد اقصیٰ' یعنی حضرت سلیمان کی تعمیر کردہ مسجد سے مختلف ایک اصطلاح ہے) آپ نے اپنی تحریر میں اس بنیادی نکتے کو تسلیم فرماتے ہوئے لکھا ہے:

''اس مسجد پر مسلمانوں کے استحقاق کی وجہ تاریخی طور پر یہ ہے کہ جب مسلمانوں نے اس مقام پر مسجد کو تعمیر کیا تھا تو اس وقت یہ جگہ ویران تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود یہاں سے کوڑا کرکٹ صاف کر کے اس مسجد کو قائم کیا تھا۔ خلیفۂ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ جیسا عادل حکمران کسی اور قوم کی عبادت گاہ پر اسلامی مرکز تعمیر کر کے کسی دوسری قوم کا مذہبی حق غصب کرے گا۔'' (محدث، مارچ ۲۰۰۷، ۵)

''اگر یہود اس علاقے میں کوئی ہیکل تعمیر کرنا بھی چاہتے ہیں جس سے ان کے مذہبی جذبات وابستہ ہیں تو اس کے لیے مسجد اقصیٰ کا انہدام کیوں ضروری ہے اور وہ عین اس مقام پر ہی کیوں تعمیر ہوتا ہے جہاں یہ مقدس عمارت موجود ہے؟ مسجد اقصیٰ کے احاطے میں شمال مغربی حصہ اور دیگر بہت سے حصے بالکل خالی ہیں، وہاں وہ قبہ بھی ہے جس کے بارے میں اکثر مسلم علما کا موقف یہ ہے کہ اس قبۂ صخرہ کی کوئی شرعی فضیلت نہیں، حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہاں نماز پڑھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ یوں بھی یہود کے ہاں قبلہ کی حیثیت اس کو حاصل رہی ہے کیونکہ

انھوں نے خیمۂ اجتماع کو اپنا قبلہ بنایا ہوا تھا جو قبۂ صخرہ کے مقام سے اٹھا لیا گیا، چنانچہ قبۂ صخرہ کو اس کا آخری مقام ہونے کے ناتے انھوں نے اسے ہی اپنا قبلہ قرار دے لیا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہود قبۂ صخرہ پر کوئی تصرف کرنے کی بجائے سارا زور مسجد اقصیٰ پر ہی صرف کر رہے ہیں؟'' (۱۸)

ان اقتباسات کی روشنی میں میرے ناقص فہم کے مطابق نتیجے کے اعتبار سے آپ کے موقف اور میرے نقطۂ نظر میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ البتہ اس کے ساتھ اپنی تحریر کے آخر میں آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

''امت مسلمہ کے فرزند آج ۴۰ برس گزرنے کے بعد بھی نہ صرف مطمئن و پرسکون ہیں، بلکہ آہستہ آہستہ کوتاہی اور مداہنت یوں اپنا اثر دکھا رہی ہے کہ مسلمانوں میں بعض ایسے کرم فرما بھی پیدا ہو گئے ہیں جو مسجد اقصیٰ کو اسی طرح یہود کی تولیت میں دے دینے کے داعی ہیں جیسے مسلمانوں کے پاس بیت اللہ الحرام کی تولیت ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' (۲۰)

اگر یہ اشارہ ــــــ جیسا کہ گمان غالب ہے ــــــ میری تحریروں کی طرف ہے تو میں، فی الواقع، آپ کی اس تعریض کا مدعا نہیں سمجھ سکا۔ اگر مسجد اقصیٰ سے آپ کی مراد حضرت سلیمان علیہ السلام کا تعمیر کردہ ہیکل ہے جس کا محل وقوع قبۃ الصخرہ کے قریب ہے تو اس پر تصرف اور تولیت کی اجازت، بلکہ ترغیب تو آپ خود بھی یہود کو دے رہے ہیں، اور اگر اس سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مخصوص کردہ مقام پر تعمیر کی جانے والی مسجد یعنی موجودہ 'مسجد اقصیٰ' ہے تو میری تحریر میں کہیں بھی اس کی تولیت یہود کے سپرد کر دینے کی بات نہیں کہی گئی، بلکہ ''الشریعہ'' کے اپریل/ مئی ۲۰۰۴ کے شمارے میں، میں نے اس بحث کا اختتام ہی اس نکتے پر کیا ہے کہ:

''مسلمانوں کو پوری دیانت داری کے ساتھ اپنے موجودہ موقف پر نظر ثانی کرتے ہوئے ان بے بنیاد مذہبی تصورات کو خیر باد کہنا ہوگا جو پوری عبادت گاہ سے یہود کے حق تولیت کی تنسیخ یا قبۃ الصخرہ کی اہمیت و تقدس کے حوالے سے وضع کر لیے گئے ہیں اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کی اتباع میں اپنے حق کو اس جگہ تک محدود ماننا ہوگا جہاں روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کا تذکرہ ملتا ہے اور جسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی عبادت کے لیے مخصوص فرما دیا تھا۔'' (۴۷)

آپ کے مضمون میں اٹھائے جانے والے بعض قانونی نکات اور واقعاتی تفصیلات پر بحث و اختلاف کی گنجایش موجود ہے، لیکن ان سے قطع نظر کرتے ہوئے موجودہ مسجد اقصیٰ کے انہدام کے حوالے سے جن صیہونی عزائم کا آپ نے ذکر کیا ہے، وہ اگر درست ہیں تو یقیناً امت مسلمہ کو اپنے حق کا دفاع پوری جرات اور استقامت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ خدا کرے کہ امت مسلمہ کے دل میں ''اپنے حق'' کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ''نفس حق'' کو پہچاننے اور اس کو

تسلیم کرنے کا جذبہ بھی بیدار ہو جائے۔

محترم حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب اور ادارہ کے دیگر رفقا کی خدمت میں سلام اور آداب عرض ہے۔

محمد عمار خان ناصر

گوجرانوالہ

۱۷/ مارچ ۲۰۰۷

—— ۲ ——

لاہور، ۲۵/ مارچ ۲۰۰۷ء

برادر گرامی محمد عمار خاں ناصر صاحب، مدیر ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا مراسلہ ملا، شکر گزار ہوں کہ مسجد اقصیٰ کے حالات و واقعات پر مبنی میرے مضمون کا نہ صرف آپ نے مطالعہ کیا، بلکہ اس کی افادیت اور واقعاتی استدلال سے بھی اتفاق فرمایا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اطمینان اس امر پر ہے کہ آپ نے اپنے مراسلے کے آخر میں مسجدِ اقصیٰ کے تحفظ کے بارے میں ان جذبات سے بھی اتفاق ظاہر کیا جو مسلم امہ میں بالعموم پائے جاتے ہیں۔ آپ کے الفاظ میں ''موجودہ مسجد اقصیٰ کے انہدام کے حوالے سے جن صہیونی عزائم کا آپ نے ذکر کیا ہے، وہ اگر درست ہیں تو یقیناً امت مسلمہ کو اپنے حق کا دفاع پوری جرات اور استقامت کے ساتھ کرنا چاہیے۔'' مزید برآں میرے موقف پر یہ تبصرہ کہ ''کوئی اصولی اختلاف غالباً نہیں کیا جا سکتا'' لکھ کر بھی آپ نے میرے استدلال کو تقویت بخشی۔

میرا یہ مضمون مسجد اقصیٰ کے بعض حالیہ واقعات کے حوالے سے تھا اور میں نے مضمون کے مقدمہ میں ہی اس امر کی صراحت کر دی تھی کہ مسجد اقصیٰ پر دینی رسائل میں جاری شرعی بحث سے اس مضمون کا کوئی تعلق نہیں اور اس حوالے سے مستقل مضمون درکار ہے۔ چنانچہ میرے اس مضمون میں شرعی موقف کو سرے سے پیش نہیں کیا گیا تھا، اس کے باوجود میرے لیے یہ امر چونکا دینے والا ہے کہ مسجد اقصیٰ کی شرعی تولیت پر تین برس قبل شائع ہونے والے آپ کے طول طویل مباحث اور ان کے نتائج سے آپ نے مجھے بھی از خود متفق قرار دے لیا ہے اور اس اتفاق کے اظہار کے لیے آپ نے میرے مضمون کے دو اقتباسات پیش کیے ہیں۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ ان اقتباسات کو سیاق

سے کاٹ کر آپ نے اپنے من مانے مفہوم میں لیا ہے جبکہ ان سے میرا مدعا ہرگز وہ نہیں جو آپ باور کرا رہے ہیں۔ آپ میرے مضمون کے مطالعے کی بجائے ان سے وہ شواہد تلاش کرتے رہے ہیں جن سے کسی طور آپ کے متنازعہ موقف کی ہم نوائی ہوتی ہو، وگرنہ ان اقتباسات کا یہ مفہوم میرے حاشیہ خیال میں بھی موجود نہیں۔ آپ کو بخوبی یاد ہوگا کہ آپ کے مضامین کی اشاعت کے بعد علما کے حلقے میں سے غالباً کوئی ایک رائے بھی آپ کی تائید میں شائع نہیں ہوئی اور مسجد اقصیٰ پر آپ کے مضامین دینی صحافت کے متنازعہ ترین مقالات میں سے ہیں جس پر ''الشریعہ'' کے متعدد مراسلے اور مستقل مضامین بھی شاہد ہیں، جبکہ میرے مضمون کا موضوع ہی اس سے مختلف ہے۔ بہرحال آپ نے یہ الفاظ ''میرے ناقص فہم کے مطابق نتیجے کے اعتبار سے آپ کے موقف اور میرے نکتہ نظر میں کوئی خاص فرق نہیں''، لکھ کر جس طرح مجھے اپنا ہم نوا قرار دیا ہے، اس سے میں متفق نہیں ہوں کیونکہ جہاں تک میرے شرعی موقف کا تعلق ہے تو میں اس پر ایک مستقل مقالہ لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ آپ کے موقف کے بارے میں فی الحال چند تنقیحات پر اکتفا کرتا ہوں:

○ کیا آپ صہیونیت کے نام نہاد دعوے 'ہیکل سلیمانی' کے قائل نہیں بلکہ اس کو دوبارہ تعمیر کرنے کے مؤید بھی ہیں؟

○ کیا آپ مسجد اقصیٰ پر مسلمانوں کی بجائے یہود کو تولیت کا حق دینے کے داعی نہیں؟

○ کیا آپ مسلمانوں کے موقف کو جذباتی، غیر اخلاقی اور غیر شرعی قرار نہیں دیتے؟

○ کیا آپ دیوارِ گریہ کے قائل نہیں اور اسے بھی یہود کا حق قرار دیتے ہیں؟

جبکہ دوسری طرف مسلم اُمہ کے زعما بالعموم ان میں سے کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے۔

جہاں تک 'واقعاتی نتیجہ' میں بظاہر اتفاق کا مسئلہ ہے تو میری رائے میں اس کی حیثیت بھی چند الفاظ کے اشتراک سے زیادہ کچھ نہیں، حقیقت اور امر واقعہ اس کے عین برعکس ہے۔ ماضی قریب میں آپ کے پیش کردہ 'ممکنہ حل' اور موجودہ مراسلہ کے گہرے مطالعے کے بعد میں پوری بصیرت سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے اور آپ کے پیش کردہ نتیجے میں عملاً کوئی مماثلت نہیں پائی جاتی۔ آپ احاطہ قدس میں یہودیوں کی شراکت کے قائل ہیں جبکہ میں اس سے متفق نہیں۔ اس سلسلے میں مزید تفصیلات پر گفتگو کرنے سے قبل میری گزارش ہے کہ اس موضوع پر آپ کی سابقہ تحریروں کی غیر معمولی طوالت کی وجہ سے بعض بنیادی باتوں کے بارے میں آپ کے موقف میں نکھار باقی نہیں رہا۔ اشتراک کا شائبہ پیدا ہونے کی وجہ یہی ابہام اور احتمال ہے۔ اگر آپ حسب ذیل سوالات کی دوٹوک وضاحت فرما سکیں تو آپ

کے مراسلہ میں ذکر کردہ دعوائے اتفاق پر میں اپنا بادلائل موقف پیش کرسکوں گا۔اس دوٹوک نکھار کی ضرورت اس لیے زیادہ ہے کہ اس طرح کئی برس سے جاری یہ بحث بہت جلد کسی حتمی نتیجہ پر پہنچ جائے گی:

۱۔مسجد اقصیٰ اور ہیکل سلیمانی آپ کی نظر میں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، آپ کے نزدیک اس [حقیقی][۱] مسجد اقصیٰ کا مصداق کون سی جگہ ہے؟ قبہ صخرہ،فوارۂ کاس، [حالیہ] مسجد اقصیٰ یا کوئی اور؟

۲۔[حالیہ] مسجد اقصیٰ جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی تھی، کیا [حقیقی] مسجد اقصیٰ یہی نہیں؟ اگر نہیں تو آپ اس مسجد کو کیا حیثیت دیتے ہیں؟

۳۔[حقیقی] مسجد اقصیٰ پر کیا مسلمانوں اور یہود ہر دو اقوام کا استحقاق ہے، اگر دونوں کا حق مشترک ہے تو اس حق کی نوعیت کیا ہے اور ان میں سے کس کا حق آپ برتر سمجھتے ہیں؟

۴۔حق کی برتری کی صورت میں عملاً اس قوم کے لیے آپ کیا اقدام تجویز کرتے ہیں اور مرجوح حق والی قوم کے لیے کیا؟

۵۔شدرحال والی متفق علیہ حدیث (مساجدِ ثلاثہ) اور مسجد اقصیٰ میں نماز کی فضیلت والے فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کی آپ مسلمانوں کے لیے عملی صورت کیا تجویز کرتے ہیں؟

چونکہ اس بحث کو آپ نے ہی شروع کیا اور اس کے ہر پہلو پر تفصیل سے تحقیق بھی فرمائی، اس لیے اس بحث کے ان اہم نکات کا دوٹوک جواب بھی اخلاقاً آپ کو دینا چاہیے کیونکہ حق کو واضح ہونا چاہیے اور اس میں کوئی ابہام نہیں رہنا چاہیے۔بہتر ہوگا کہ آپ دوٹوک اور معروضی اسلوب میں ان کے جواب دے کر تفصیلی دلائل کے لیے اپنے ۱۵۰ صد سے زائد صفحات کے متعین پیراگرافوں کی نشاندہی کردیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کے جوابات کے بعد پیش نظر مسئلہ کافی حد تک از خود ہی واضح ہو جائے گا۔تاہم آپ کے جواب کے بعد میں بڑی وضاحت اور صراحت سے اپنا تفصیلی موقف تحریر کروں گا، تاکہ اس اہم شرعی مسئلہ پر ہمارے قارئین کسی واضح نتیجہ تک پہنچ سکیں۔ان شاءاللہ

اللّٰهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه

حافظ حسن مدنی، لاہور

۱۔ ان سوالات میں [ ] میں درج الفاظ کی تقسیم جناب عمار ناصر صاحب کی ہے، محض تعین کے لیے ان کو استعمال کیا گیا ہے۔

برادرم حافظ حسن مدنی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج گرامی؟

میرے خط کے جواب میں آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ بے حد شکریہ! میں اشتیاق کے ساتھ منتظر رہوں گا کہ مسجد اقصیٰ کی تولیت کے شرعی پہلو سے متعلق آپ کا مستقل مضمون کب معرض تحریر میں آتا ہے اور اس میں آپ کیا نقطۂ نظر اختیار فرماتے اور اس کے حق میں کیا استدلالات پیش کرتے ہیں۔ سر دست میں اپنی گزارشات کو آپ کے حالیہ مکتوب کے مندرجات تک محدود رکھوں گا۔

آپ نے فرمایا ہے کہ میں نے آپ کے مضمون سے اپنے اور آپ کے موقف میں جو اشتراک اخذ کیا ہے، وہ درست نہیں، بلکہ ایسا آپ کے اقتباس کو سیاق وسباق سے ہٹا کر من مانے معنی پہناتے ہوئے کیا گیا ہے۔ تاہم آپ نے اس اقتباس سے میرے اخذ کردہ نتیجے کی تردید تو فرمائی ہے، لیکن اپنے مضمون کے سیاق وسباق کی روشنی میں اس کا صحیح مدعا اور مفہوم واضح کرنے کی زحمت نہیں کی۔ میں آپ کا اقتباس یہاں دوبارہ نقل کرنا چاہوں گا:

> ''اگر یہود اس علاقے میں کوئی ہیکل تعمیر کرنا بھی چاہتے ہیں جس سے ان کے مذہبی جذبات وابستہ ہیں تو اس کے لیے مسجد اقصیٰ کا انہدام کیوں ضروری ہے اور وہ عین اس مقام پر ہی کیوں تعمیر ہوتا ہے جہاں یہ مقدس عمارت موجود ہے؟ مسجد اقصیٰ کے احاطے میں شمال مغربی حصہ اور دیگر بہت سے حصے بالکل خالی ہیں، وہاں وہ قبہ بھی ہے جس کے بارے میں اکثر مسلم علما کا موقف یہ ہے کہ اس قبہ صخرہ کی کوئی شرعی فضیلت نہیں، حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے یہاں نماز پڑھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔... پھر کیا وجہ ہے کہ یہود قبہ صخرہ پر کوئی تصرف کرنے کی بجائے سارا زور مسجد اقصیٰ پر ہی صرف کر رہے ہیں؟'' (محدث، مارچ ۲۰۰۷، ۱۸)

ازراہ کرم آپ واضح فرمائیں کہ جب آپ ہیکل کی تعمیر کے لیے یہود کو موجودہ مسجد اقصیٰ کے بجائے احاطۂ ہیکل ہی میں واقع دیگر مقامات، مثلاً قبۃ الصخرہ وغیرہ کی راہ دکھا رہے ہیں اور یہ بھی بتا رہے ہیں کہ ان مقامات کی آپ کے نزدیک کوئی شرعی فضیلت نہیں تو اس کا مطلب مذکورہ مقامات پر تصرف وتولیت میں عدم دلچسپی ظاہر کرنے کے سوا کیا نکلتا ہے؟ اگر یہود آپ کی دکھائی ہوئی راہ پر چلتے ہوئے قبۃ الصخرہ کی جگہ پر اپنا ہیکل تعمیر کرنا چاہیں تو وہ آخر زمین کے اوپر ہی بنے گا یا 'بغیر عمد ترونها' فضا میں معلق ہوگا؟ اور اگر آپ یہود کا ہیکل تعمیر کرنے کا حق تو تسلیم

کرتے ہیں، لیکن احاطے یا ہیکل کی تولیت میں انھیں کسی طرح بھی شریک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو یہ واضح فرمایے کہ کیا ہیکل کی تعمیر کے بعد یہودی قوانین کے مطابق اس میں رسوم عبادت ادا کرنے اور کاہنوں سے متعلقہ مذہبی خدمات بجالانے کا فریضہ بھی آپ خود ہی انجام دیں گے؟ اور اگر یہ حق بھی آپ یہود کے لیے تسلیم کرتے ہیں تو مذہبی معنوں میں کسی عبادت گاہ پر تصرف وتولیت اور کیا چیز ہوتی ہے؟

کوئی مصنف جب اپنی تحریر سے واضح طور پر نکلنے والے کسی نتیجے کو 'own' کرنے سے انکار کرتا ہے تو اس کی وجہ یا تو یہ ہوتی ہے کہ اس نے وہ تحریر اچھی طرح سوچ سمجھ کر نہیں لکھی ہوتی اور یا یہ کہ وہ اپنی تحریر میں ملفوف نتیجے کا واضح اعتراف کرنے کے لیے درکار اخلاقی جرات سے محروم ہوتا ہے۔ میں حسن ظن رکھتا ہوں کہ آپ کے معاملے میں یہ دوسری صورت نہیں پائی جاتی۔

آپ نے اپنے مکتوب کے آخر میں میرے موقف کے حوالے سے جن نکات کی وضاحت طلب فرمائی ہے، ان سب کی تفصیل میں اپنی تحریروں میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں، تاہم آپ کی فرمایش پر انھیں دوبارہ دہرا دیتا ہوں:

۱۔ قرآن مجید نے 'مسجد اقصیٰ' کا لفظ ہیکل سلیمانی کے لیے استعمال کیا ہے۔ موجودہ احاطۂ ہیکل کے اندر اس کا محل وقوع یقینی طور پر معلوم نہیں، تاہم غالب گمان کے مطابق اس کو صخرۂ بیت المقدس (جس کے اوپر اس وقت 'قبۃ الصخرۃ' قائم ہے) کے قرب وجوار میں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ صخرہ بنی اسرائیل کے لیے قبلے کی حیثیت رکھتا تھا اور ہیکل کی عمارت کے اندر ہی واقع تھا۔ اس وقت مسلمان جس مسجد کو 'مسجد اقصیٰ' کہتے ہیں، وہ عین ہیکل سلیمانی کی جگہ پر واقع نہیں، بلکہ احاطۂ ہیکل کی جنوبی دیوار کے قریب اس جگہ تعمیر کی گئی ہے، جہاں فتح بیت المقدس کے موقع پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نماز ادا فرمائی تھی۔

۲ و ۵۔ موجودہ مسجد اقصیٰ، ہیکل سلیمانی (یعنی قرآن مجید کی ذکر کردہ 'مسجد اقصیٰ') کی اصل عمارت کا حصہ نہ ہونے کے باوجود توسیعی طور پر مسجد ہی کے حکم میں ہے، اس لیے اس میں نماز ادا کرنے کی وہی فضیلت اور ثواب ہے جو صحیح احادیث میں مسجد اقصیٰ کے حوالے سے ثابت ہے۔

۳ و ۴۔ بنی اسرائیل کی مرکزی عبادت گاہ، قربان گاہ اور قبلہ ہونے کے ناتے سے ہیکل سلیمانی یعنی اصل مسجد اقصیٰ کی تولیت شرعی واخلاقی طور پر انھی کا استحقاق ہے اور قرآن وسنت میں ان کے اس حق کی تنسیخ کی کوئی دلیل نہیں۔ مسلمانوں کا حق اس مسجد کے حوالے سے یہ ہے کہ انھیں یہاں عبادت کرنے کی پوری آزادی حاصل ہو۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ہیکل سلیمانی کی اصل عمارت کے بجائے اس سے بالکل ہٹ کر احاطۂ ہیکل کے جنوب میں،

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جہاں اس وقت موجودہ مسجد اقصیٰ واقع ہے، مسلمانوں کے لیے عبادت کی جگہ متعین کر کے دونوں اقوام کے مذہبی حق کے تحفظ اور پاس داری کی ایک واضح صورت متعین فرما دی تھی اور امت مسلمہ کو اسی کی پابندی کرنی چاہیے۔

اگر اس ضمن میں مزید کوئی نکتہ وضاحت طلب ہو تو میں اس کے لیے حاضر ہوں۔

محمد عمار خان ناصر

۲۵ مارچ ۲۰۰۷

—— ۴ ——

لاہور، ۲۶ مارچ ۲۰۰۷ء

برادر محترم جناب محمد عمار خان ناصر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا جواب موصول ہونے پر شکرگزار ہوں۔ سردست آپ کے حسب ارشاد اس اقتباس کے سیاق پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جسے آپ اپنے موقف کی حمایت قرار دینے پر مصر ہیں۔ جیسا کہ میں پچھلے مراسلے میں تحریر کر چکا ہوں کہ میں نے حالیہ مضمون شرعی موقف کے حوالے سے عمداً نہیں لکھا کیونکہ اس مضمون کی وجہ تحریر مسجد اقصیٰ پر حالیہ جارحیت بنی تھی نہ کہ دینی رسائل میں جاری ۴ سالہ پرانی بحث، اسی بنا پر میں نے مقدمہ میں بھی اس کی صراحت کو مناسب خیال کیا۔ چنانچہ میرے اس مضمون میں ان واقعات کو ترتیب وار پیش کیا گیا کہ مسجد اقصیٰ ان دنوں کن حالات سے دوچار ہے۔ اس بنا پر کوئی شخص ان واقعات کے وقوع سے انکار کرے، یا انھیں مفروضہ قرار دے تو ایسا اعتراض تو اس مضمون کے ضمن میں کیا جا سکتا ہے، البتہ جب میں نے کوئی شرعی موقف خود بھی اختیار نہیں کیا اور اس کے دلائل نہیں دیے، تو میری ایک عبارت سے اپنے تئیں وہ موقف کیسے کشید کیا جا سکتا ہے، جس سے تعرض نہ کرنے کا صاحبِ مضمون خود شروع میں اظہار کر چکا ہے۔

آپ کا کہنا ہے کہ ''نتیجے کے اعتبار سے آپ کے موقف اور میرے نکتہ نظر میں کوئی خاص فرق نہیں۔'' یہ دعویٰ کرنا اس وقت ممکن ہوتا جب یہ کہا جا سکتا کہ میں نے بھی آپ کے 'ممکنہ حل' کی طرح، اپنے پیش کردہ اقتباس کے ذریعے صہیونی شورشوں کا یہ حل پیش کیا ہے کہ قبہ صخرہ یہود کے حوالے کر دیا جائے۔ جبکہ میرے مضمون میں مسجد اقصیٰ پر اسرائیلی تسلط کے بعد ۴۰ سالہ مختصر تاریخ، ہیکل مزعوم کی تعمیر کے صہیونی جنون کا تذکرہ اور حالیہ جارحیت کے ۴/

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

امکانات پیش کرنے کے بعد موجودہ مقام، جہاں یہ جارحیت ہوئی ہے، کی غیر معمولی اہمیت کو پیش کرنے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے اور آخر میں امت مسلمہ کو ان کا فرض یاد دلایا گیا ہے۔ اس مقام کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے میں نے یہ قرار دیا ہے کہ صہیونیوں کا مزعومہ ہیکل کوئی مجرد دعویٰ نہیں بلکہ اس میں مسجد اقصیٰ کا انہدام ایک لابدی امر ہے کیونکہ ارضِ مقدس کو مسلم شعور سے کھرچنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ اگر ان کے پیش نظر مسجد اقصیٰ کا انہدام نہیں بلکہ محض ہیکل سلیمانی کی تعمیر ہوتا تو انھوں نے یہ مزعومہ ہیکل موجودہ مسجد اقصیٰ کے علاوہ کسی اور نقطہ پر تعمیر کیوں نہیں کیا؟ جبکہ وہاں احاطہ قدس کے باہر بھی جگہیں خالی ہیں، مسجد اقصیٰ کے ماسوا اس احاطے میں بھی خالی مقامات اور اہم عمارتیں مثلاً قبہ صخرہ وغیرہ بھی موجود ہیں، ان کو چھوڑ کر عین مسجد اقصیٰ کے نیچے ہیکل کی موجودگی کا دعویٰ ہندووں کے اس دعوے کے مشابہ ہے جو وہ ہندوستان میں کئی مساجد کے حوالے سے کر چکے ہیں کہ وہ عین قدیم مندروں پر تعمیر کی گئی ہیں، ایسے دعوے کرنے والوں کے پیش نظر اپنے مرکز کی تعمیر کی بجائے دراصل دوسری قوم کی عبادت گاہ کو مسمار کرنے کا مکروہ عزم کارفرما ہوتا ہے۔ میرے اس اقتباس کا رجحان ہیکل کی تعمیر کے جواز اور اس کا محل ذکر کرنے کی بجائے عین مسجد اقصیٰ کے انہدام کے صہیونی ہدف کی مؤکد نشاندہی اور ان کے عزائم کو آشکارا کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے مضمون کے آخر میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ اس پورے احاطہ قدس پر استحقاق صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص ہے۔ عجب بات ہے کہ ایک عبارت کو لکھنے والے کے مدعا کی بجائے، مضمون کی دیگر عبارتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے اور سیاق وسباق کے برعکس اپنے ذہن میں پہلے سے موجود نکتہ کو نہ صرف اصل دعویٰ قرار دے دیا جائے بلکہ موقف بھی بنا دیا جائے۔ مذکورہ اقتباس کی ترکیب سے بھی میرے موقف ہونے کی نفی ہوتی ہے، کیونکہ یہ سارا اقتباس محض ایک مفروضہ ہے جس کی نشاندہی جملے کے آغاز میں درج لفظ 'اگر' کے ساتھ بھی ہو رہی ہے۔

راقم کا تو یہ محض مفروضہ ہے جس کا ہدف بھی وہ ہے جو اوپر ذکر ہو چکا، جبکہ دوسری طرف آپ اس موقف کے پرزور داعی ہیں جیسا کہ پہلے خط کے آخر میں ''الشریعہ'' اپریل ۲۰۰۴ء میں شائع شدہ آپ کا اقتباس شاہد ہے۔ آپ کے طویل شرعی موقف کی طرح ـــــ جس نے دردمندانِ ملت کے دلوں کو زخمی کیا ہوا ہے ـــــ آپ کا 'ممکنہ حل' بھی معصومیت اور حقائق سے منہ موڑنے کی نادر مثال ہے۔ آپ کو راقم کی تحریر کی تہ میں چھپا ہوا اشتراک تو نظر آتا ہے، جس کی صریح نفی بھی ساتھ ہی موجود ہے لیکن راقم کے ذکر کردہ ۴۰ برس پر محیط وہ مسلسل صہیونی اقدامات دکھائی نہیں دیتے جو آپ کے 'ممکنہ حل' کا منہ چڑا رہے ہیں اور اسے کلیتاً ناقابل عمل بتا رہے ہیں۔ میرا مضمون (جسے 'حالات کی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

رپورٹ اور تبصرہ' کہنا زیادہ بہتر ہوگا) آپ کے ممکنہ حل کی پوری قلعی کھول دیتا ہے۔ آپ ایک بار اپنے سلسلۂ مضامین کا تتمہ (بعنوان 'ممکنہ حل') ملاحظہ فرمالیں اور پھر اس کا راقم کے مضمون سے تقابل کرلیں، تو آپ پر 'مزعومہ اشتراک' کی پوری حقیقت کھل جائے گی: (۱) آپ امت مسلمہ کی بجائے یہود کو مسجد اقصیٰ کا متولی قرار دیتے ہیں (۲) اور قبہ صخرہ یا اس کے اردگرد کو حقیقی مسجد اقصیٰ کا مصداق سمجھتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ موجودہ مسجد اقصیٰ جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی، مسلمانوں کی خودساختہ قرار پاتی ہے (۳) جسے آپ خودساختہ کہنے کی بجائے حقیقی مسجد اقصیٰ کے توسیعی حکم میں شامل ہونے کی توجیہ فرماتے ہیں۔ قبہ صخرہ کو مسجد اقصیٰ کے حقیقی مصداق ہونے کی بنا پر آپ اسے یہود کو دینے کے پرزور داعی اس بنا پر ہیں کہ آپ کے نزدیک اصل مسجد شرعاً یہود کی زیر تولیت ہی ہونی چاہیے۔ یاد رہے کہ آپ کے موقف کے یہ مرکزی نکات پوری مسلم امہ کے چودہ صد سالہ موقف بلکہ تعامل کے صریح مخالف گویا قرآنی اصطلاح میں 'سبیل المومنین سے انحراف' کے زمرے میں آتے ہیں۔ اب میرے مضمون کو دیکھیے، میں نے ان نظریاتی بحثوں کی بجائے موجودہ مسجد اقصیٰ پر صہیونیوں کے ۴۰ سالہ منفی اقدامات کو ذکر کیا ہے۔ یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ یہود کا ۴۰ سالہ جارحانہ طرز عمل بھی آپ کی اس توجیہ اور 'ممکنہ حل' کی کسی طور تائید نہیں کرتا؟ چنانچہ یہاں پہنچ کر آپ یہود کی بعض تحریروں کا سہارا لیتے ہوئے ان کے کھلے ظالمانہ طرز عمل سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ میرا آپ سے سوال ہے کہ اگر یہود قبہ صخرہ پر ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو

۱۔ ان کی تمام کوششیں مسجد اقصیٰ کو مسمار کرنے پر کیوں مرکوز ہیں، گزشتہ ۴۰ برسوں میں قبہ صخرہ یا کوئی اور مقام ان کی جارحیت کا نشانہ یا عزائم کا مرکز کیوں نہیں ٹھہرا جبکہ آپ کے خیال میں یہود کے نزدیک یہی مقام مزعومہ ہیکل کا اصل مرکز ہے۔ یاد رہے کہ یہ قبہ بھی موجودہ مسجد اقصیٰ کی طرح مسلم خلیفہ ولید بن عبدالملک بن مروان کا ہی تعمیر کردہ ہے کیونکہ علامہ ابن تیمیہؒ کی تصریح کے مطابق دور خلفاے راشدین میں صخرہ بیت المقدس محض ایک ننگی چٹان تھی۔

۲۔ صہیونیوں نے سرنگیں بھی مسجد اقصیٰ کے نیچے کھودی ہیں تاکہ وہ ازخود منہدم ہو جائے نہ کہ قبہ صخرہ کے نیچے، اگر ان کا ہدف قبہ صخرہ (آپ کے نزدیک: مزعومہ ہیکل کا مرکز) ہے تو ان کی جارحیتوں کا مرکز مسجد اقصیٰ کیوں ہے؟

۳۔ یہود کے نزدیک مزعومہ ہیکل سلیمانی کی آخری یادگار (مزعومہ دیوار گریہ) بھی مسجد اقصیٰ کے بالکل متصل ہے جبکہ قبہ صخرہ تو اس سے کہیں فاصلے پر ہے۔ اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ یہود موجودہ مسجد اقصیٰ کو ہی ہیکل سلیمانی کا مرکز سمجھتے ہیں نہ کہ قبہ صخرہ کو۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۴۔ یہود نے ۱۹۸۸ء اور ۱۹۸۹ء میں مسجد اقصیٰ میں ہیکل سلیمانی کا دو بار سنگ بنیاد رکھا اور یہ دونوں مقام قبہ صخرہ سے کافی دور جبکہ موجودہ مسجد اقصیٰ سے ملحق تھے۔

۵۔ صہیونیوں نے ۴ بار جس مقام کو بم سے اڑانے کی کوشش کی، وہ مقام بھی مسجد اقصیٰ ہے نہ کہ قبہ صخرہ!

۶۔ حالیہ شورشوں اور جارحیتوں کا مرکز باب المغاربہ ہے جو مسجد اقصیٰ کا براہِ راست دروازہ ہے، مزید برآں اسرائیلی تسلط کے فوراً بعد ۱۹۶۷ء میں اس سے ملحق محلّہ حی المغاربہ ہی صہیونی جارحیتوں کا مرکز بنا تھا، یہ شورشیں کبھی قبہ صخرہ کے براہ راست دروازوں اور محلوں پر نہیں ہوئیں۔ ایسے ہی حالیہ جارحیت کا مقصد بھی اسی جنوب مغربی حصہ کو ہی مسمار کرنا ہے۔ اس سے بھی بخوبی یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہودی مسجد اقصیٰ ہی کو نعوذ باللہ مسمار کر کے وہاں اپنا خود ساختہ ہیکل بنانے کا ارارہ رکھتے ہیں۔

۷۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ۱۱/ اپریل ۲۰۰۵ء کو ایریل شیرون نے واشنگٹن میں جو منصوبہ امریکی حکومت کو پیش کیا ہے اور امریکی حکومت نے اس کی تائید کی ہے، وہ مسجد اقصیٰ کے مقام پر ہیکل کی تعمیر کا ہے، نہ کہ قبہ صخرہ کی جگہ پر۔ ان کا منصوبہ ہے کہ وہ احاطہ قدس کو مسلمانوں اور یہودیوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں یعنی جنوب مغربی حصہ (موجودہ مسجد اقصیٰ) پر اپنے ہیکل کی تعمیر اور قبہ صخرہ کو مسلمانوں کے لیے چھوڑ دینا۔

مذکورہ بالا نکات کے بعد پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ آپ کا یہ کہنا کہ یہود قبہ صخرہ پر ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اور وہ اسے ہی قدیم مسجد اقصیٰ کا مصداق تصور کرتے ہیں، اور یہی آپ کی نظر میں ممکنہ حل بھی ہے (جس میں آپ مجھے بھی اپنے تئیں شریک جرم ٹھہرا رہے ہیں) زمینی حقائق، ۴۰ سالہ واقعات اور اسرائیلی سرکاری منصوبوں سے نہ تو اس دعوے کی کسی طور تائید ہوتی ہے اور نہ ہی یہ کوئی قابل عمل حل قرار پاتا ہے۔ اس کے بعد برادر موصوف کی یہ بے جا معصومیت ہے کہ وہ مسلم امہ کے حق اور زمینی حقائق سے بے پروا ہو کر، ان غیروں کے حق کی جستجو میں اپنی اور دوسروں کی صلاحیتیں کھپا رہے ہیں جن کی مسلم دشمنی پر قرآن کریم میں کئی آیات شاہد ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اپنے مضامین کے آغاز میں انھوں نے مسلمانوں کو اخلاقیات کا درس دیتے ہوئے اپنے سارے استدلال کی بنیاد قانون کی بجائے اخلاقیات پر استوار کی ہے۔ لیکن اسرائیل کے فلسطینیوں سے ظالمانہ رویہ سے چشم پوشی کرتے ہوئے ان کے پورے مضمون میں اخلاقیات کا یہ وعظ کہیں یہود کے لیے دکھائی نہیں دیتا۔

مجھے بخوبی احساس ہے کہ ایک حساس علمی اور تاریخی موضوع کے نتائج کو دلائل و حقائق سے صرف نظر کرتے ہوئے جس طرح میں نے قارئین کی غیر معمولی استعداد کے سہارے پر ذکر کر دیا ہے، اس سے استفادہ کافی مشکل

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہوگا۔لیکن برادر محترم نے ہی ایک ایسے مسئلہ میں مجھے الجھا کر جو ابھی مستقلاً موضوع بحث نہیں تھا، ہمیں اس مشترکہ الجھن سے دوچار کیا۔ان کا اپنے دعویٰ پر لگاتار اصرار ہی اس تحریر کا باعث بنا ہے، وگرنہ میں اب بھی اس پوری بحث کو مستقل طور پر کتاب وسنت، تعامل صحابہؓ اور ائمہ اسلاف کے دلائل و براہین سے مزین کر کے کسی اور موقعہ پر نکات وار تفصیلاً پیش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ واضح رہے کہ میرے اس مراسلے کا تمام تر دارومدار بھی حقائق و واقعات ہی ہیں نہ کہ شرعی استدلال! جناب عمار کو میری تحریر میں سے اپنے مطلوبہ نکات کشید کرنے کی بجائے میرے مرکزی استدلال پر اپنی توجہ صرف کرنی چاہیے۔ مذکورہ بالا واقعاتی تفصیلات میرے حالیہ مضمون میں موجود ہیں جس سے مزعومہ اشتراک کشید کرنے کی بجائے کہیں بہتر ہوتا کہ وہ اپنے 'ممکنہ حل' کا میرے پیش کردہ واقعات کی روشنی میں جائزہ لے لیتے تو اپنے موقف پر مجھے گھسیٹنے کی بجائے، اس درست موقف کی طرف رجوع کر لیتے جو صدیوں سے امت مسلمہ کا رہا ہے اور اپنے اس 'ممکنہ حل' پر بھی اصرار نہ کرتے جس کی تردید یہود کے ۴۰ سالہ مسلسل عمل سے ہوتی ہے۔ واللہ الموفق!

مخلص

حافظ حسن مدنی

—— ۵ ——

برادرم حافظ حسن مدنی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔مزاج گرامی؟

میرے لیے یہ بات خوشی کا باعث ہے کہ آخر کار آپ کو اپنے اس اقتباس کی، جس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ آپ قبۃ الصخرۃ وغیرہ کی کوئی شرعی فضیلت واہمیت نہ ہونے کے باعث امت مسلمہ کے لیے اس کی تولیت کے دعوے دار نہیں ہیں، ایک تاویل سوجھ گئی ہے، یعنی یہ کہ یہ سارا اقتباس آپ کی حقیقی رائے کا ترجمان نہیں، بلکہ محض ایک ''مفروضے'' پر مبنی تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس صورت حال میں قارئین بہترین منصف ہوتے ہیں، اس لیے میں مزید بحث میں اپنا اور آپ کا وقت ضائع کرنے کے بجائے یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس نکتے کا فیصلہ ''الشریعہ'' اور ''محدث'' کے قارئین پر چھوڑ دیا جائے[1]۔

---

[1] قارئین فیصلہ کرتے وقت یہ نکتہ بالخصوص ملحوظ رکھیں کہ میں نے اپنے پہلے خط میں برادرم حسن مدنی صاحب کے دو اقتباسات

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

البتہ میں یہ ضرور واضح کرنا چاہوں گا کہ ''محدث'' کی یہ روش نئی نہیں ہے۔ اس سے قبل جب میری رائے ۲۰۰۳ء میں پہلی مرتبہ ''الشریعہ'' اور ''اشراق'' میں شائع ہوئی تھی تو ''محدث'' کے غالباً نومبر اور دسمبر ۲۰۰۳ کے شماروں میں اس پر ایک ''بلند پایہ علمی تنقید'' شائع ہوئی تھی۔ اس کی پہلی قسط میں 'فاضل' مضمون نگار (جناب عطاء اللہ صدیقی) نے موجودہ عرب زعما کے اس موقف کی پرزور تائید کی تھی کہ بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کا تاریخ میں کبھی کوئی وجود نہیں رہا اور یہ محض ایک صہیونی مفروضہ ہے، لیکن مضمون کی دوسری قسط میں، سابقہ رائے میں کسی قسم کی تبدیلی کا کوئی تاثر دیے بغیر، اس کے بالکل برعکس یہ موقف سامنے آ گیا کہ حضرت سلیمان کی تعمیر کردہ مسجد اقصیٰ یعنی ہیکل سلیمانی پر یہود کا حق تولیت شریعت اسلامی کی رو سے منسوخ کر دیا گیا ہے۔ میں نے ایک خط میں مضمون نگار سے دریافت کیا تھا کہ اگر ہیکل سلیمانی کا کبھی کوئی وجود ہی نہیں تھا تو شریعت اسلامی نے یہود کا حق تولیت آخر کس چیز سے منسوخ کیا ہے؟ تاہم انھوں نے اس کا کوئی جواب دینا پسند نہیں کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ انھیں ازخود اپنے پہلے موقف کے ناقابل دفاع ہونے کا احساس ہوا اور انھوں نے چپکے سے پینترا بدل لیا یا ادارہ ''محدث'' نے اعلیٰ صحافیانہ اخلاقیات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا موقف مضمون نگار کی طرف منسوب کر دیا۔ یہ خط آپ کی دلچسپی کے لیے منسلک ہے۔

بہرحال اس سارے معاملے پر مجھے کوئی حیرت نہیں۔ آپ کے لیے 'عالم عرب' کے موقف سے کھلا اختلاف نہ کر سکنا پوری طرح قابل فہم ہے۔ میں آپ کے شرعی موقف اور اس کے دلائل پر مبنی مقالہ کا شدت سے منتظر رہوں گا۔

محمد عمار خان ناصر

۲۶ مارچ ۲۰۰۶

نقل کیے تھے جن میں سے دوسرے اقتباس کو تو انھوں نے 'اگر' کے لفظ کا سہارا لیتے ہوئے ''مفروضہ'' قرار دیا ہے، لیکن پہلے اقتباس پر نظر ڈالنے کی زحمت نہیں کی۔ حضرت عمر کے ہاتھوں موجودہ مسجد اقصیٰ کی تاسیس اور اس پر مسلمانوں کے استحقاق کا دفاع کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے: ''خلیفۂ راشد حضرت عمر کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ جیسا عادل حکمران کسی اور قوم کی عبادت گاہ پر اسلامی مرکز تعمیر کر کے کسی دوسری قوم کا مذہبی حق غصب کرے گا'' جس کا مطلب یہ ہے کہ جس جگہ حضرت عمر نے مسجد قائم کی، وہ یہود کی عبادت گاہ کا محل وقوع نہیں تھی، ورنہ حضرت عمر کا یہ اقدام 'غصب' قرار پاتا۔ حسن اتفاق سے یہ اقتباس 'اگر' سے شروع نہیں ہوتا، لیکن اب وہ اپنے خطوط میں فرماتے ہیں کہ موجودہ مسجد اقصیٰ ہی حقیقی مسجد اقصیٰ (یعنی حضرت سلیمان کا تعمیر کردہ ہیکل) ہے اور اس پر مسلمانوں کا حق جتانا 'غصب' نہیں بلکہ ان کا شرعی و تاریخی 'حق' ہے۔ (عمار)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جناب عمار خان ناصر کا جناب عطاء اللہ صدیقی کے نام مکتوب

مکرمی عطاء اللہ صدیقی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

مسجد اقصیٰ کے حوالے سے اپنے نقطۂ نظر پر آپ کی تنقید میں نے بغور پڑھی ہے۔ یہ نقطۂ نظر ظاہر ہے، اسی لیے پیش کیا گیا تھا کہ اہل قلم اس پر تنقید کریں تا کہ معاملہ ہر پہلو سے منقح ہو سکے۔ یہ عریضہ اس بات پر آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں کہ آپ نے اپنے علم وفہم اور افتاد طبع کے مطابق اس بحث میں حصہ لیا اور گو بنیادی مسئلے پر میری رائے میں سر دست کوئی تبدیلی نہیں آئی، تاہم آپ کی تنقید میں بعض نئے نکات اٹھائے گئے ہیں اور بعض جزوی چیزوں کے حوالے سے مجھے اپنے مضمون کے مندرجات کا از سر نو جائزہ لینے کا موقع ملا ہے۔

اس ضمن میں آپ کے نقطۂ نظر کے حوالے سے ایک بات البتہ وضاحت طلب ہے۔ عالم عرب کے موجودہ رہنما اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ ہیکل سلیمانی موجودہ 'الحرم الشریف' کی چار دیواری کے اندر کہیں واقع تھا، چنانچہ وہ یہود کے حق تولیت کی تنسیخ کی بحث سے بھی کوئی تعرض نہیں کرتے، اس لیے کہ یہ بحث 'relevant' ہی اس صورت میں قرار پاتی ہے جب تباہ شدہ ہیکل کا مقام اس احاطۂ مقدسہ کے اندر تسلیم کیا جائے جو اس وقت مسلمانوں کے زیر تصرف ہے۔ لیکن آپ نے اپنے مضمون کے پہلے حصے میں تو عالم عرب کے نقطۂ نظر کا دفاع کیا ہے، لیکن دوسرے حصے میں حق تولیت کی تنسیخ کے نقطۂ نظر کے حق میں بھی دلائل فراہم کر دیے ہیں۔ میں، فی الواقع نہیں سمجھ سکا کہ اگر ہیکل موجودہ احاطہ مقدسہ کے اندر تھا ہی نہیں تو پھر یہود کا حق تولیت آخر کس چیز پر سے منسوخ کیا گیا ہے؟ اگر آپ اپنے موقف کی وضاحت فرما سکیں تو ممنون ہوں گا۔

عمار ناصر

۱۱ دسمبر ۲۰۰۳

---

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

طالب محسن

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی کے تلامذہ ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بھولا اور سیانا مومن

سوال: احادیث میں ہے: 'المؤمن غر کریم...' (مومن مہربان بھولا ہے...)، 'لا یلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین...' (مومن ایک بل سے دو بار نہیں ڈسا جاتا...)، 'اتقوا فراسة المؤمن فإنه یری بنور ربه...' (مومن کی فراست سے بچو وہ اپنے رب کے نور سے دیکھتا ہے...)۔ بظاہر ان روایات میں تناقض ہے۔ ان روایتوں کو کس طرح جمع کریں گے؟ (وحدت یار)

جواب: دونوں باتوں کا محل الگ الگ ہے۔ شارحین نے بالکل صحیح بیان کیا ہے کہ اس سے فریب اور چالاکی کی نفی کی گئی ہے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ مومن سمجھ دار نہیں ہوتا۔ مومن خدا کے حضور جواب دہی کے احساس کے تحت فریب اور سازش جیسے مکروہ کاموں سے گریزاں رہتا ہے۔ دوسرے وہ حسن ظن اور خیر خواہی کے جذبے کے تحت خود غرضی اور موقع پرستی جیسے عوارض سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے رویے اور عمل میں ایک سادہ آدمی نظر آتا ہے۔ غالباً یہی بات ہے جس کے لیے 'غر کریم' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ دوسری روایتوں میں مومن کے سمجھ دار ہونے کے پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی سمجھ کا اعلیٰ ترین اظہار اخلاق کی درستی اور جذبات کے صحیح رخ پر

استوار ہونے میں ہے۔ دین کی تعلیمات دل و دماغ میں اتر جائیں اور عمل اس کے مطابق ڈھل جائے تو وہ فراست حاصل ہو جاتی ہے جسے فراست مومن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ باقی رہے دنیا کے شر تو اللہ تعالیٰ ان سے حفاظت کا بندوبست ایسے صالحین کے لیے اپنی جناب سے کرتے رہتے ہیں۔

امریکہ سے جہاد

سوال: موجودہ حالات میں افغانستان میں امریکہ کے خلاف جہاد کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ کیا اس کو جہاد کہہ سکتے ہیں۔ کیا کسی خاص شرائط میں انفرادی جہاد جائز ہے۔ مثلاً کسی اسلامی ملک پر کافر یلغار کریں اور حکومت وقت بزدل ہو کر کفار سے ہم نوا ہو جائے۔ اس صورت حال میں دین کا تقاضا کیا ہے؟ (وحدت یار)

جواب: ہماری رائے میں حالات خواہ کچھ بھی ہوں، انفرادی جہاد جائز نہیں ہے۔ حکومت کا بزدل ہونا یا جہاد کی ذمہ داری ادا نہ کرنا کسی مسلمان کو اس کا مکلّف نہیں ٹھہراتا کہ وہ خود جہاد کرنے لگے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ حکومت کو اس کی ذمہ داری ادا کرنے پر آمادہ کرے اور جب تک حکومت آمادہ نہ ہو کوئی قدم آگے نہ بڑھائے۔ سیاسی گروہوں کی سیاسی جدوجہد دنیوی سیاست ہے۔ اسے خواہ مخواہ دینی عنوانات دینے سے صورت حال پیچیدہ ہوتی ہے۔ اسلامی جہاد صرف وہ ہے جو باقاعدہ حکومت کے تحت کسی ظلم کے استیصال کے لیے ہو یا مسلم وطن کے دفاع کے لیے کیا جائے۔ باقی رہی سیاسی جدوجہد تو اس کے لیے کسی کی جان لینا دین کی رو سے جائز نہیں۔ مزید برآں امت مسلمہ کی حالت زار کے پیش نظر تدبیر کی سطح پر بھی یہ نقصان کا باعث ہے اور منزل دور سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

محتاجی سے بچنے کی دعا

سوال: میرے ہاتھ میں آپ کا رسالہ ماہنامہ ''اشراق'' ماہ جون ۲۰۰۶ ہے۔ اس کے ٹائٹل پر درج ہے: ''اللہ تعالیٰ نے یہ نظام اس طرح قائم کیا ہے کہ یہاں سب لوگ ایک دوسرے کے محتاج اور محتاج الیہ کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں۔'' میں ہی نہیں، سب لوگ یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ کسی کا محتاج نہ کرے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہم غلط دعا کرتے ہیں؟ (برکت علی)

جواب: آپ کی دعا بالکل درست ہے۔ ہماری بھی دعا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کسی کا محتاج نہ کرے۔ آمین۔ محولہ عبارت میں جو محتاجی بیان ہوئی ہے، اس میں اور ہماری دعا کی محتاجی میں فرق ہے۔ ہم تو صحت اور اپنی کمائی کے جاری رہنے کی دعا کرتے ہیں۔ صحت اس لیے کہ ہم موت تک اپنے سارے کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے ہوئے رخصت ہوں۔ کسی کی ذمہ داری نہ بن جائیں۔ اپنی کمائی اس لیے کہ ہمیں کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ محولہ عبارت میں محتاجی سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی معیشت کا پہیہ چلانے کے لیے دونوں طرح کے لوگوں کی ضرورت ہے۔ ایک وہ جو سرمایہ فراہم کریں اور انتظام کریں اور دوسرے وہ جوان کے لیے کام کریں۔ اس طرح لوگ مختلف خدمات انجام دیتے ہیں اور معیشت کی گاڑی رواں دواں رہتی ہے۔ غرض یہ کہ اس عبارت میں اس نوعیت کی خدمات کے لیے محتاج اور محتاج الیہ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

قومی بچت سرٹیفکیٹ

سوال: عمر کے ساتھ ساتھ میرے سب جوڑ ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ میں صرف ۲۴۰۰ روپے پنشن حاصل کرتا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف ۸۱ سال ہے۔ بے کاری کی مدت بھی تقریباً چھ سال ہوگئی ہے۔ اب پنشن ۳۰۰۰ روپے ملتی ہے۔ جو اس زمانے میں گزارے کے لیے ناکافی ہے۔ مزید یہ کہ کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔ میں نے اپنی رقم سے جو رکھے رکھے کم سے کم ہوتی جا رہی تھی، قومی بچت کے دفتر سے سرٹیفکیٹس بہبود اسکیم لے لیے ہیں۔ ان سے بھی تقریباً ۳۰۰۰ روپے مل جاتے ہیں۔ اس طرح چھ ہزار روپے سے کچھ گزارہ ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کے ساتھ کاروبار میں لگا دوں تو آپ کے علم میں ہوگا کہ قرآن چھاپنے والے ادارے بھی لوگوں کے پیسے ہضم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ سرٹیفکیٹ کی آمدنی حرام ہے۔ بتائیے میں کیا کروں؟ (عبداللہ)

جواب: سرٹیفکیٹ سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے، وہ سود کی آمدنی ہے۔ حکومت نے عوام سے قرضہ لینے کے لیے یہ اسکیم بنائی ہوئی ہے۔ حکومت اس قرض پر عوام کو سود ادا کرتی ہے۔ آپ نے جیسے اپنے حالات لکھے ہیں، ان میں آپ کو کوئی دوسرا مشورہ دینا مشکل ہے۔ بہر حال، اگر آپ اپنے آپ کو اس معاملے میں معذور سمجھتے ہیں اور آپ

کے لیے کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے تو آپ اس آمدنی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ آپ کے عذر کے پیش نظر آپ کے اس معاملے سے درگزر فرمائیں گے۔ لیکن یہ فیصلہ آپ ہی نے کرنا ہے کہ آپ معذور ہیں اور آپ کو یہ روپے لے لینے چاہییں۔

آپ کا سوال یہی تھا، جو میں نے اوپر نقل کر دیا ہے۔ باقی آپ نے ان لوگوں کی مثالیں دی ہیں جو لوگوں کے ساتھ دھوکا اور فریب کر کے انھیں لوٹ رہے ہیں۔ آپ یہ مثالیں دے کر اپنا یہ خیال موکد کرتے ہیں کہ سرٹیفکیٹ کی آمدنی لینا، اس طرح لوگوں کو لوٹنے سے بہتر ہے۔ دیکھیے، جس طرح ان لوگوں کی آمدنی حرام ہے، اسی طرح سود کی آمدنی بھی حرام ہے۔ صورت واقعہ کے پہلو سے اگر کچھ فرق ہے تو وہ اس کو جائز نہیں بنا سکتا۔ ہاں، ایک معذور آدمی کے نقطۂ نظر سے آپ کا اسے ترجیح دینا سمجھ میں آتا ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

حضرت نوح علیہ السلام کی عمر پر اشکال

سوال: قرآن مجید میں آتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال دعوت و تبلیغ کا کام کیا۔ اب تک میرا خیال تھا کہ انسان کی اوسط زندگی اور قد کاٹھ ایک جیسا ہی ہے۔ دو چار انچ یا پانچ دس سال کا فرق تو سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن روایات میں عوج بن عنق کے قد کاٹھ کے بارے میں جس طرح مبالغہ آرائی پائی جاتی ہے، وہ حقیقت نظر نہیں آتی۔ چونکہ ان کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے، اس لیے ہم آسانی سے اس کی تردید کر سکتے ہیں۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی ۹۵۰ سال تبلیغ کا ذکر قرآن مجید میں ہے جس کو ہم کسی صورت نہیں جھٹلا سکتے۔ کیا حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے تمام افراد کی عمریں اتنی ہی تھیں؟ اس قوم کے قد کاٹھ ہمارے جیسے تھے یا ان کی نوعیت کچھ اور تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ اب سے چار پانچ ہزار سال پہلے بتاتے ہیں۔ چار پانچ ہزار سال انسانی تاریخ میں کوئی معنی نہیں رکھتے۔ یہ بات کسی طور سمجھ میں نہیں آتی کہ صرف چار ہزار سال پہلے کسی کی عمر ہزار سال ہو۔ قرآن سے کسی اور پیغمبر کے بارے میں اس طرح کی بات معلوم نہیں ہوتی۔ (محمد عارف جان)

جواب: حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ قبل تاریخ کا زمانہ ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ بائیبل میں دیے گئے شجرۂ نسب سے حضرت آدم اور حضرت نوح وغیرہ کے زمانے کا اندازہ لگانا درست نہیں

ہے۔اس شجرۂ نسب میں وہی نام باقی رہ گئے ہیں جو بہت معروف ہو گئے تھے اور بیچ کی کئی نسلیں غائب ہیں۔ان کے خیال میں یہ درحقیقت بڑے بڑے سرداروں کے نام ہیں۔ایک اور دوسرے شخص کے بیچ میں ممکن ہے، کئی سو برس کا فاصلہ ہو۔ان کی اس رائے کو سامنے رکھیں جو واضح طور پر درست لگتی ہے تو حضرت نوح کے زمانے کے بارے میں کوئی اندازہ قائم کرنا ممکن نہیں۔البتہ اگر کوئی خارجی شواہد موجود ہوتے تو ہمیں کوئی رائے قائم کرنے میں مدد مل سکتی تھی۔لیکن حضرت نوح کے حوالے سے ایسے کوئی شواہد میرے علم کی حد تک ابھی تک نہیں ملے۔

اب ہمارے پاس واحد یقینی ذریعہ قرآن مجید ہے۔قرآن مجید میں بھی صرف حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ہی کا ذکر ہے۔کوئی اور بات اس زمانے کے انسانوں کے حوالے سے مذکور نہیں ہے۔ بائیبل کتاب پیدایش کے باب ۵ اور ۶ میں جو تفصیل منقول ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لمبی عمروں کا یہ سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ختم کر دیا گیا۔قرآن مجید کے بیان کی روشنی میں ہم یہ اندازہ ہی لگا سکتے ہیں کہ بائیبل کا یہ بیان درست ہو۔لیکن یقینی رائے کے لیے سائنسی شواہد کی دستیابی ضروری ہے، البتہ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کا بیان حتمی ہے اور ان کے بارے میں ہم یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی عمر یہی تھی۔

یہ سوال کہ اس زمانے کے لوگوں کے قد کاٹھ کیا تھے، اس کا واحد ماخذ اسرائیلی روایات ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اس سلسلے میں جو کچھ مروی ہے، وہ انھی روایات سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔لہٰذا اس باب میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ جو خارجی شواہد ابھی تک سامنے آئے ہیں، ان سے تو قد کاٹھ کے بارے میں ان بیانات کی تائید نہیں ہوتی۔لیکن قبل تاریخ کے انسان کے بارے میں ان تصورات کی قطعی تردید بھی شاید ابھی ممکن نہیں ہے۔

معلوم تاریخ کے انسان کی عمر اور قد کاٹھ کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ آج کے انسان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔خارجی شواہد یعنی عمارتیں اور دوسرے آثار سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔لیکن کیا اس کی روشنی میں ہم قرآن کے بیان کی نفی کر سکتے ہیں۔ یقیناً اس نفی کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔قرآن کے بیان کو ماننے کے بعد ہم یہ اندازہ بھی قائم کر سکتے ہیں کہ ان کے زمانے میں عام عمریں بھی ایسی ہی تھیں۔اس اندازے کی تائید بائیبل کے بیان سے بھی ہوتی ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کی عمر کو ایک معجزہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ باقی رہا قد کاٹھ تو اس باب میں کوئی یقینی بات ہمارے پاس نہیں ہے۔خارجی شواہد کی روشنی میں ہم ان اسرائیلی روایات کو رد بھی کر سکتے ہیں۔

محمد رفیع مفتی

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی کے تلامذہ ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ڈاڑھی اور اسبال ازار

سوال: ڈاڑھی اور اسبال ازار یعنی ٹخنوں پر لباس کے بارے میں غامدی صاحب کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

(فضل کریم بھٹی)

جواب: ڈاڑھی اور ٹخنوں پر لباس وغیرہ کے حوالے سے غامدی صاحب نے اپنا نقطۂ نظر اپنی کتاب ''اخلاقیات'' میں ''غرور و تکبر'' کے عنوان کے تحت درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی (تکبر کی) بنا پر ایسی تمام چیزوں کے استعمال سے منع کیا ہے جن سے امارت کی نمایش ہوتی ہو یا وہ بڑائی مارنے، شیخی بگھارنے، دون کی لینے، دوسروں پر رعب جمانے یا اوباشوں کے طریقے پر دھونس دینے والوں کی وضع سے تعلق رکھتی ہوں۔ ریشم پہننے، قیمتی کھالوں کے غلاف بنانے اور سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے سے آپ نے اسی لیے روکا ہے۔ یہاں تک کہ چھوٹی ڈاڑھی اور بڑی بڑی مونچھیں رکھنے والوں کو بھی یہ متکبرانہ وضع ترک کر دینے کی نصیحت کی اور فرمایا ہے کہ وہ اپنا یہ شوق ڈاڑھی بڑھا کر پورا کر لیں، لیکن مونچھیں ہر حال میں چھوٹی رکھیں۔ (اس نصیحت کا صحیح مفہوم یہی تھا، مگر لوگوں نے اسے ڈاڑھی بڑھانے کا حکم سمجھا

اوراس طرح ایک ایسی چیز دین میں داخل کر دی جو اس سے کسی طرح متعلق نہیں ہو سکتی۔)''(۶۲)

شلوار یا ازار اب ٹخنوں سے اوپر رکھنا اسی صورت میں ضروری ہے، جبکہ اسے ٹخنوں سے نیچے رکھنا آج بھی تکبر کی علامت ہو۔ جو چیز ہمیشہ کے لیے ممنوع ہے، وہ لباس میں تکبر کے کسی پہلو کا موجود ہونا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں تہ بند باندھنے میں تکبر کے پہلو کی نفی کرنے کے لیے یہ حکم دیا تھا کہ اسے ہر شخص ٹخنوں سے اوپر رکھے۔ یہ حکم اصولاً لباس میں موجود تکبر کے ہر پہلو کی نفی کرنے کے لیے تھا۔

تصویر کا مسئلہ

سوال: کیا جان دار کی تصویر بنانا اسلام میں جائز نہیں ہے؟ تصویر کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے؟
(فضل کریم بھٹی)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جواب: تصویر کے بارے میں عمومی نقطۂ نظر یعنی یہ کہ جان دار کی تصویر ناجائز اور بے جان کی جائز ہے، یہ درست نہیں ہے۔ صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہر وہ تصویر ناجائز ہے، جو کسی بھی درجے میں مظہر شرک ہے۔ یہی بات قرآن مجید کی واضح رہنمائی سے ہمارے سامنے آتی اور یہی احادیث صحیحہ سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے۔ صحابہ اور تابعین کا فہم بھی یہی حکم لگاتا اور ان کا عمل بھی اسی کے مطابق دکھائی دیتا ہے۔ یہی بات قدیم آسمانی مذاہب میں پائی جاتی ہے۔

قرآن و حدیث میں تصاویر پر جتنی تنقید بھی کی گئی ہے، وہ سب مشرکانہ تصاویر کے حوالے سے ہے۔ عام نوعیت کی تصاویر کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ وہ تصاویر جن میں شرک کے علاوہ کوئی اور دینی یا اخلاقی خرابی پائی جاتی ہے، وہ بھی دینی طور پر بالکل ممنوع ہیں۔ لیکن تصویر پر بحیثیت تصویر، خواہ وہ جان دار کی ہو یا بے جان کی، دین کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ خدا کا دین تصویر بنانے کو صرف اور صرف اس وقت ممنوع قرار دیتا ہے، جب اس میں کوئی دینی یا اخلاقی خرابی پائی جاتی ہو۔

برمودا مثلث

سوال: ڈاکٹر عبدالغنی صاحب نے برمودا مثلث کے بارے میں ملنے والی معلومات کی بنا پر اپنا یہ نقطۂ نظر

بیان کیا ہے کہ برمودا مثلث دراصل سجین کی طرف جانے والا راستہ ہے اور اس علاقے میں جو اڑن طشتریاں دکھائی دیتی ہیں، وہ درحقیقت وہ فرشتے ہیں جو ارواح کو سجین کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ اپنے اس خیال کو ڈاکٹر رے مونڈا اے موڈی (Dr. Raymond A Moodi) کی کتاب ''موت کے بعد زندگی'' میں بیان کردہ واقعات سے موکد کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر موڈی نے کچھ ایسے لوگوں کے بارے میں معلومات دی ہیں، جنھیں 'Clinically Dead' قرار دیا گیا، لیکن کسی وجہ سے وہ دوبارہ زندہ ہو گئے، چنانچہ ان کے ذریعے سے ہمیں موت کے بعد ہونے والے بعض واقعات کے بارے میں پتا چل گیا۔

برمودا مثلث کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون حیدر آباد سے شائع ہونے والے رسالے ''بیداری'' کے مئی ۲۰۰٦ کے پرچے میں چھپا ہے۔ میرا آپ سے یہ سوال ہے کہ آپ کے خیال میں کیا ڈاکٹر عبدالغنی صاحب کی یہ تحقیق درست ہے؟ (عبدالوحید خان)

جواب: ڈاکٹر عبدالغنی فاروق صاحب نے برمودا مثلث کے بارے میں موجود معلومات کی جو توجیہ بیان کی ہے، یہ ان کی ایک رائے ہے، جس پر کوئی شخص غور و فکر کر سکتا ہے۔

البتہ اس بات میں پریشانی کی کوئی چیز نہیں کہ خدا کی کائنات کے بہت سے راز تا حال سربستہ ہیں، ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں ان میں سے کچھ انسان پر منکشف ہو جائیں اور بہت سے کبھی منکشف نہ ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے جس وادی میں قدم رکھنے کی کوشش کی ہے، ہمارا خیال ہے کہ اس میں قدم رکھنا درست نہیں ہے۔ فرشتے کیا اس طرح کا اپنا کوئی ظہور رکھتے ہیں، ہمارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟ ہو سکتا ہے کہ یہ جنات کی کوئی دنیا ہو یا ہو سکتا ہے کہ یہ خدا کی کوئی ایسی مخلوق ہو جس کے بارے میں ہمیں خدا کی طرف سے کوئی علم دیا ہی نہیں گیا۔

ڈاکٹر موڈی کی ''موت کے بعد زندگی'' کے حوالے سے کی گئی تحقیقات دراصل، ان کے اس خیال پر مبنی ہیں کہ ایک آدمی کچھ دیر کے لیے واقعتاً مر کر دوبارہ اس دنیا میں واپس آ سکتا ہے۔ وہ جن لوگوں کو 'Clinically Dead' قرار دے رہے ہیں، ان کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو فی الواقع مر چکے تھے اور فرشتے ان کی روحیں نکال چکے تھے، لیکن پھر کسی وجہ سے ان کی ارواح ان کے جسموں میں لوٹا دی گئیں۔ چنانچہ اس صورت حال میں ہمیں عالم برزخ کے احوال کے بارے میں کچھ انسانوں کے مشاہدات جاننے کا موقع مل گیا۔

ہمارے خیال میں یہ سرتاسر لغو بات ہے۔ قرآن مجید موت کے بعد عالم برزخ میں داخل ہونے والوں کے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بارے میں ہمیں یہ خبر دیتا ہے:

''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوگی تو وہ کہے گا کہ اے رب، مجھے پھر واپس بھیج کہ جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں کچھ نیکی کماؤں۔ ہرگز نہیں، یہ محض ایک بات ہے، جو وہ کہنے والا بنے گا اور ان کے آگے اُس دن تک کے لیے ایک پردہ ہوگا، جس دن وہ اٹھائے جائیں گے۔'' (المومنون ۲۳: ۹۹-۱۰۰)

نیز فرمایا:

''اور اللہ تعالیٰ ہرگز کسی جان کو ڈھیل دینے والا نہیں، جبکہ اس کی مقررہ مدت آ پہنچے گی۔'' (المنافقون ۶۳: ۱۱)

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق صاحب کا خیال ہے کہ ڈاکٹر ریمونڈ اے موڈی نے کچھ دیر کے لیے مر کر دوبارہ زندہ ہو جانے والے جن افراد کے بارے میں اپنی تحقیقات پیش کی ہیں، یہ دراصل، وہ دوزخی افراد ہیں جنھیں پہلے وفات دے دی گئی اور فرشتے ان کی روحوں کو سجین کی طرف لے گئے، لیکن پھر کسی وجہ سے ان کی ارواح ان کے جسموں میں لوٹا دی گئیں۔

ہمارے خیال میں اس تصور سے قرآن کا بیان باطل ہو جاتا ہے۔

حلالہ کی شرعی حیثیت

سوال: حلالہ کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر کیا ہے؟ کیا اسلام میں اس کی گنجایش ہے؟ (احمد اختر)

جواب: تیسری طلاق اور اس کے ضمن میں حلالہ سے متعلق بحث کو استاذ محترم جاوید احمد صاحب غامدی نے اپنی کتاب ''قانون معاشرت'' میں درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

''ایک رشتۂ نکاح میں دو مرتبہ رجوع کے بعد تیسری مرتبہ پھر علیحدگی کی نوبت آ گئی اور شوہر نے طلاق دے دی تو اس کے نتیجے میں عورت ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جائے گی، الا یہ کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہو اور وہ بھی اسے طلاق دے دے۔

ارشاد باری ہے:

''پھر اگر اُس نے (تیسری مرتبہ) طلاق دے دی تو اِس کے بعد وہ عورت اُس کے لیے جائز نہ ہوگی، جب تک اُس کے سوا کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے۔ پھر اگر اُس نے بھی طلاق دے دی تو اُن دونوں کے لیے ایک

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضایقہ نہیں، اگر یہ توقع رکھتے ہوں کہ اب وہ حدود الٰہی پر قائم رہ سکیں گے۔ اور یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں جنھیں وہ اُن لوگوں کے لیے واضح کر رہا ہے جو جاننا چاہتے ہیں۔'' (البقرہ ۲: ۲۳۰)

پہلے شوہر کے ساتھ نکاح کے لیے قرآن نے اس آیت میں تین شرطیں بیان فرمائی ہیں:

ایک یہ کہ عورت کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرے۔

دوسری یہ کہ اس سے بھی نباہ نہ ہو سکے اور وہ اسے طلاق دے دے۔

تیسری یہ کہ وہ دونوں سمجھیں کہ دوبارہ نکاح کے بعد اب وہ حدود الٰہی پر قائم رہ سکیں گے۔

پہلی اور دوسری شرط میں نکاح سے مراد عقد نکاح اور طلاق سے مراد وہی طلاق ہے جو آدمی نباہ نہ ہونے کی صورت میں علیحدگی کا فیصلہ کر لینے کے بعد اپنی بیوی کو دیتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ لفظ نکاح شریعت اسلامی کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کا اطلاق ایک عورت اور مرد کے اس ازدواجی معاہدے پر ہوتا ہے جو زندگی بھر کے نباہ کے ارادے کے ساتھ زن وشو کی زندگی گزارنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اگر یہ ارادہ کسی نکاح کے اندر نہیں پایا جاتا تو وہ فی الحقیقت نکاح ہی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک سازش ہے جو ایک عورت اور ایک مرد نے باہم مل کر کر لی ہے۔ نکاح کے ساتھ شریعت نے طلاق کی جو گنجایش رکھی ہے تو وہ اصل اسکیم کا کوئی جزو نہیں ہے، بلکہ یہ کسی ناگہانی افتاد کے پیش آ جانے کا ایک مجبورانہ مداوا ہے۔ اس وجہ سے نکاح کی اصل فطرت یہی ہے کہ وہ زندگی بھر کے سنجوگ کے ارادے کے ساتھ عمل میں آئے۔ اگر کوئی نکاح واضح طور پر محض ایک معین و مخصوص مدت تک ہی کے لیے ہو تو اس کو متعہ کہتے ہیں اور متعہ اسلام میں قطعی حرام ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس نیت سے کسی عورت سے نکاح کرے کہ اس نکاح کے بعد طلاق دے کر وہ اس عورت کو اس کے پہلے شوہر کے لیے جائز ہونے کا حیلہ فراہم کرے تو شریعت کی اصطلاح میں یہ حلالہ ہے اور یہ بھی اسلام میں متعہ ہی کی طرح حرام ہے۔ جو شخص کسی کی مقصد برآری کے لیے یہ ذلیل کام کرتا ہے، وہ درحقیقت ایک قرم ساق یا بھڑوے یا جیسا کہ حدیث میں وارد ہے 'کرایے کے سانڈ' کا رول ادا کرتا ہے اور ایسا کرنے والے اور ایسا کروانے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۵۳۷)'' (۶۲-۶۴)

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net